بیادِ اقبال

مقالات

مرتبہ :

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

سنگ میل پبلی کیشنز ، لاہور

بیادِ اقبالؒ

مقالات

جو

یوم اقبال ۲۰ ر اپریل و ۲۶ ر اپریل ۱۹۶۸ء میں پڑھے گئے

○

سنگِ میل پبلی کیشنز

چوکِ اُردو بازار ــــ لاہور

مجلسِ یادگارِ اقبالؒ

سرپرست :- ڈاکٹر محمد باقر پروفیسر امریطس، جامعۂ پنجاب

اراکین :- ڈاکٹر وحید قریشی، استاد شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، لاہور

ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک، استاد شعبۂ عربی اورینٹل کالج۔ لاہور

ڈاکٹر سید محمد اکرم، اُستاد شعبۂ فارسی، اورینٹل کالج، لاہور

کنوینر :- ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، استاد شعبہ اردو اورینٹل کالج، لاہور

قیمت -/۱۰

پبلشرز نیاز احمد سنگ میل پبلیکیشنز لاہور

پرنٹر :- نذیر حسین ندرت پرنٹرز لاہور

مضامین

۱۔ پیش لفظ : مرتب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵

۲۔ خطبۂ صدارت : ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمٰن ۔ ۔ ۔ ۱۱

۳۔ قائدینِ ملت ۔ اقبال کا معیار : پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۷

۴۔ اقبال ۔ دیدہ و شنیدہ : ۔ ۔ ۔ پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللہ ۲۷

۵۔ اقبال کا نظریۂ تعلیم :
(مشاہدات کی روشنی میں) ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ۔ ۔ ۔ ۴۳

۶۔ اقبال کے کلام میں رباعی کی اہمیت : سید عابد علی عابد ۵۹

۷۔ پیامِ مشرق پر ایک نظر : ڈاکٹر سید محمد اکرم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۷۵

۸ ۔ اقبال اور تحریکِ اتحادِ اسلامی :۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ۔۔۔ ۹۳

۹ ۔ اقبال اور قومی زبان ۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ۔۔۔ ۱۰۶

پیش لفظ

مجلسِ یادگارِ اقبال یونیورسٹی اورینٹل کالج کی تشکیل اور اس کے اغراض و مقاصد نیز زیرِ نظر مجموعۂ مضامین (بسلسلۂ یومِ اقبال) کی ترتیب پر کچھ عرض کرنے سے پہلے اقبال اور اورینٹل کالج کے تعلق پر ایک اجمالی نظر ڈالنی ضروری ہے۔

اورینٹل کالج سے اقبال کا تعلق مدۃ العمر تک کئی حیثیتوں سے رہا۔ اوّل، طالب علم کی حیثیت سے، دوم اُستاد، محقق اور مصنّف کی حیثیت سے اور پھر ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے (مختلف انتظامی، علمی بورڈوں اور فیکلٹیوں میں) اقبال اورینٹل کالج کے تعلیمی اور تحقیقی مسائل سے دلچسپی لیتے رہے۔

اقبال نے ۱۸۹۵ء میں سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۸۹۷ء میں اُنھوں نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ بی۔ اے میں اقبال کے مضامین، انگریزی، عربی اور فلسفہ تھے۔ اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں السنہ شرقیہ (عربی، فارسی، سنسکرت) کی تدریس کا کام یونیورسٹی اورینٹل کالج کے سپرد تھا جو گورنمنٹ کالج ہی کی عمارت کے شمال مشرقی گوشے میں مقیم تھا

!(یہ انتظام ۱۸۸۴ء سے ۱۹۱۲ء تک رہا) اس لحاظ سے اقبال بی۔ اے میں عربی کا مضمون اورینٹل کالج میں پڑھتے تھے۔ ان جماعتوں کو عربی مولوی محمد الدین ایم۔ او۔ ایل (متوفّی ۲۶، نومبر ۱۸۹۸ء) پڑھاتے تھے اور اقبال کے اُستاد یہی تھے۔ بحیثیت طالبعلم اورینٹل کالج سے اقبال کا یہ پہلا تعلّق تھا جو ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۷ء تک دو سال رہا۔
بی۔ اے میں عربی کے مضمون میں وہ اوّل آئے اور تمغہ حاصل کیا۔ دو سال بعد اُن کی یہی استعداد اُنھیں اورینٹل کالج میں بحیثیت میکلوڈ عربک ریڈر لانے کا ذریعہ بنی۔

۱۸۹۹ء میں اقبال نے ایم۔ اے (فلسفہ) کا امتحان پاس کیا اور ۱۳؍مئی ۱۸۹۹ء سے وہ میکلوڈ عربک ریڈر (جو بعد میں میکلوڈ عربک ریسیرچ سکالر کہلایا) کی حیثیت سے اورینٹل کالج میں ملازم ہو گئے۔ اقبال کی ملازمت کا یہ سلسلہ مئی ۱۹۰۳ء تک رہا درمیان میں وہ دو مرتبہ تقریباً چھ چھ ماہ کی رخصت پر اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں بحیثیت اُستاد کام کرتے رہے، اس لئے مجموعی طور پر اورینٹل کالج میں اُنکی مدّت ملازمت تین سال رہی۔ (اس ملازمت کی دیگر تفصیلات کے لئے مندرجہ ذیل مضامین دیکھیے۔

علّامہ اقبال کی تعلیمی زندگی کی بعض تفصیلات، ڈاکٹر وحید قریشی (مشمولہ کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ) اقبال اورینٹل کالج میں، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (اقبال بابت اپریل ۱۹۶۲ء) بحیثیت میکلوڈ عربک ریڈر اقبال کے فرائض یہ تھے۔

۱۔ عربک کتب نصاب کی طباعت کی نگرانی۔
۲۔ عربی یا انگریزی کتابیں اُردو میں ترجمہ کرنا۔
۳۔ اورینٹل کالج میں درس دینا۔

حیاتِ اقبال کا یہ دور (۱۸۹۹ء - ۱۹۰۳ء) اورینٹل کالج کی تصنیفی روایت کے سلسلے میں بہت اہم ہے۔ کالج کی سالانہ رپورٹوں کے مطابق اس دوران میں اقبال نے چند علمی مقالات اور اقتصادیات پر اردو میں کتابیں تالیف و ترجمہ کیں۔ (۱)

ان تالیفات کی علمی حیثیت کے علاوہ ایک خاص پہلو جو قابلِ ذکر ہے، وہ اُن کا اسلوبِ نگارش ہے۔ اقبال نے علمی مطالب کو اُردو میں بیان کرنے کے لئے سادا و سلیس اور بڑا سنجیدہ اور ٹھوس منطقی لہجہ اختیار کیا ہے۔ یہ اسلوب علمی (سائنسی) کتب کی تالیف کیلئے خاص طور پر بہت اہم ہے۔

اورینٹل کالج سے اقبال کا یہ دوسرا تعلق تھا جو بحیثیت معلّم، مصنّف اور محقق تین سال تک رہا۔

---

(1) THE DOCTRINE OF THE ABSOLUTE UNITY AS EXPOUNDED BY AL-JILANI.

(2) EPITOMISED TRANSLATION OF STUBB'S EARLY PLANTAGENETS.

(3) EPITOMISED TRANSLATION OF WALKER'S POLITICAL ECONOMY.

(4) A NEW WORK ON POLITICAL ECONOMY.

"علم الاقتصاد" پر یہ آخری تالیف کسی خاص کتاب کا ترجمہ نہیں، بلکہ علم الاقتصاد پر مختلف مصنفین کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ اور یہ تالیف مطبوعہ شکل میں ملتی ہے۔ اس کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

اس کے بعد اگرچہ اقبال کا اورینٹل کالج سے براہ راست تعلق نہ رہا، تاہم بالواسطہ طور پر وہ اورینٹل کالج کے تعلیمی و انتظامی امور سے وابستہ رہے جس کی نوعیت درج ذیل ہے۔

انگلستان سے واپسی (۱۹۰۸ء) کے بعد اقبال تھوڑا عرصہ گورنمنٹ کالج میں رہے پھر وکالت میں مصروف ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد اسلامیہ کالج میں بھی عارضی طور پر فلسفے کے طلبہ کو (گھر پر) پڑھاتے رہے۔ ان معمولی تدریسی مشاغل کے علاوہ تعلیم کے میدان میں عملی طور پر وہ منتخنی سے لے کر بعض علمی مجالس کی رکنیت اور سربراہی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۶، مارچ ۱۹۱۵ء سے اقبال آرٹ فیکلٹی کے رُکن نامزد ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں اورینٹل فیکلٹی کے رُکن بنائے گئے۔ ۱۹۲۵ء کے بعد صرف اورینٹل فیکلٹی سے وابستہ رہے۔ ڈین آف اورینٹل فیکلٹی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ فلسفے اور آرٹ کے علاوہ عربی، فارسی، اُردو، پشتو کے مشترکہ بورڈ کے رُکن بھی رہے۔ آخری زمانے میں (۱۹۳۲ء کے بعد) اقبال یونیورسٹی کی ان مجالس سے عملی طور پر الگ ہو گئے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے سلسلے میں اُن کا آخری بار ذکر ۱۹۳۳ء میں آتا ہے۔ جب یونیورسٹی نے اُن کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُنھیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

اقبال اور یونیورسٹی اورینٹل کالج کے ان تعلقات کے پس منظر میں مجلس یادگار اقبال کی تشکیل اور اس کی ذمّے داریوں کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اورینٹل کالج میں ایم۔ اے (اُردو اور فارسی) میں اقبالیات کے پورے پرچے شامل نصاب ہیں جو تعلیماتِ اقبال کی تفہیم کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ علاوہ بریں اورینٹل

کالج کے اساتذہ بھی اقبالیات کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً لکھتے رہتے ہیں، تاہم ان کوششوں کو منظم اور مربوط صورت میں پیش کرنے کی اہمیت و افادیت واضح ہے حیاتِ اقبال کے مختلف گوشوں پر تحقیق کر کے ایک مستند سوانح اقبال مرتب کرنا اور فکرِ اقبال کو آسان اور سلیس انداز میں پیش کر کے ملّتِ اسلامیہ کو تعلیمات اقبال سے آگاہ کرنا، مجلس کے پیشِ نظر ہے اور اس مقصد کیلئے مجلس کے ارکان اپنی حقیر کوششوں کو جاری رکھیں گے۔

زیرِ نظر مجموعۂ مضامین اس سلسلے کی پہلی کاوش ہے۔ اس امر کی خاص کوشش کی گئی ہے کہ اہلِ علم و فن سے کچھ ایسے مضامین بھی لکھوائے جائیں جو اُن کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہوں۔ اقبال کو ہم سے جدا ہوئے تیس سال سے زائد ہو چکے ہیں۔ ابھی ایسے اصحاب ہم میں موجود ہیں جنھوں نے اقبال کو دیکھا اور اُن کی باتیں سُنیں اس سلسلے میں مجلس نے ڈاکٹر سیّد عبداللہ اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سے اس نوعیت کے مضامین حاصل کئے ہیں۔ یہ بات راقم الحروف کے علم میں تھی کہ استاذی ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب کی یادداشتوں میں اقبال کے بارے میں بعض قیمتی معلومات ہیں جنھیں پیش کرنے سے وہ بوجوہ گریزاں ہیں۔ اُنھیں اس بات کے لئے آمادہ کرنا ذرا مشکل مسئلہ تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس بارے میں مجلس کو کامیابی ہُوئی۔ اُمید ہے کہ سیّد صاحب اس سلسلے میں کچھ اور یادداشتیں بھی تحریر فرمائیں گے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کو اقبال کی بزم خلوت و جلوت میں جس طرح بار نصیب تھا، وہ اُنھی کا حصّہ ہے۔ موصوف نے اپنی بہت سی یادداشتوں کو مرتب کر رکھا ہے۔ بعض تحقیقی مسائل کے دوران راقم التحریر کو اُن سے خاصی مدد ملی۔ ڈاکٹر چغتائی کا مسوّدہ

اقبال خاصا ضخیم ہے۔ البتہ اس مسوّدے کے اسلوبِ نگارش کی تہذیب و ترتیب کا مسئلہ غور طلب ہے، اور پھر اس کی طباعت کا مرحلہ آئے گا۔ مجھے یقین ہے کہ شائقین اقبال اس میں ضرور دلچسپی لیں گے۔

زیرِ نظر مضامین ۲۰ اپریل ۱۹۶۸ء کو "یوم اقبال" کی تقریب پر بی۔ این۔ آر آڈیٹوریم میں پڑھے گئے تھے۔ ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے رحمٰن صاحب (چیف جسٹس پاکستان) نے صدارتی تقریر ارشاد فرمائی تھی، جو قلم بند کر لی گئی تھی اور اب اُن کے ملاحظے و نظرِ ثانی کے بعد یہاں شائع کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر سید محمد اکرم صاحب کا فاضلانہ مقالہ "پیامِ مشرق پر ایک نظر" ۲۶ اپریل ۱۹۶۸ء کو انجمن اُردو پنجاب یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام "یوم اقبال" پر پڑھا گیا تھا۔ اس مضمون کی افادیت کے پیشِ نظر مجلسِ یادگار اقبال اسے اس مجموعے میں شامل کر رہی ہے۔ "اقبال اور تحریکِ اتحاد اسلامی" بھی مجلسِ یادگار اقبال کے زیرِ اہتمام منعقدہ "یوم اقبال" پر پڑھا گیا تھا۔

(غلام حسین ذوالفقار)
کنوینر مجلسِ یادگار اقبال

اعتذار

یہ مضامین ۱۹۶۹ء میں کتابت ہو گئے تھے لیکن شرمندۂ طباعت نہ ہو سکے سات سال تک پردۂ غفلت میں مستور رہنے کے بعد اب طبع و شائع ہو رہے ہیں اتنی مدت کے بعد بعض مضامین میں شاید ترمیم و اضافے کی ضرورت محسوس ہو گی لیکن اس کا موقع نہیں لہٰذا معذرت کے ساتھ یہ مضمون اپنی اصل شکل میں (جیسے پڑھے گئے تھے) پیشِ خدمت ہیں۔

(مرتب)

خطبۂ صدارت

ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے رحمٰن
چیف جسٹس پاکستان
(ریٹائرڈ)

خطبۂ صدارت

میں نے آج کے مقالات کو بڑے غور اور دلچسپی سے سُنا، خصوصاً سیّد عبداللہ صاحب کا مقالہ شگفتہ واقعات پر مبنی تھا۔ میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب سے اپیل کرتا ہُوں کہ وہ اپنے حافظے پر زور دے کر علامہ اقبال کے بارے میں وہ تمام واقعات قلمبند کر ڈالیں جو اُنھیں یاد آسکیں، میں سب حضرات سے یہی التماس کرتا ہُوں کیونکہ یہی وہ اصل مواد ہے جس پر سیرت کی کتاب مبنی ہو سکتی ہے۔ اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ سیّد صاحب یہ باتیں زیبِ قرطاس فرمائیں تاکہ یہ سرمایہ محفوظ ہو سکے۔

علامہ اقبال کی زندگی کے بے شمار پہلو ایسے ہیں جن پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ علامہ اقبال کی زندگی، ان کا کلام، ان کی تعلیمات، بے شمار موضوعات حال غور ہیں علامہ اقبال ایک جنس نابغہ تھے۔ ان کے فکر اور نظامِ فکر کے کئی کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو پر طویل گفتگو ہو سکتی ہے۔

میں آج کی اس محفل میں صرف ایک پہلو کی طرف چند اشارے کرتا ہُوں۔

علاّمہ اقبال محض شاعر نہیں تھے۔ اُنھوں نے خود بھی اپنے کلام میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ؎

من شکوہِ خسروی او را دہم
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم

وہ مِلّت کو شکوہِ خسروی دینا چاہتے تھے۔ ان کا مقصود ایک فکری اور علمی تحریک پیدا کرنا تھا تاکہ اسلامی اقدار اور صیقل ہو کر سامنے آئیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مِلّت اسلامیہ اُن اقدار کو اپنائے اور اقدارِ حیات کا ایک حرکی تصوّر اپنے سامنے رکھے اور ترقی کرے۔ اسی مقصد کیلئے علاّمہ اقبال نے فلسفۂ خودی پر زور دیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اُن مقاصد کی تکمیل صرف اس کے ذریعے ہو سکتی ہے علاّمہ اقبال نے اپنی بات پُراثر اور واضح طور پر بیان کرنے کے لئے متعدد پیرائے اختیار کئے۔ کبھی اس فلسفے کو مردِ مومن کے رُوپ میں پیش کیا اور کبھی کسی اور حیثیت سے۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ فرد کی سیرت پختہ ہو تو مِلّت کی سیرت پختہ ہو سکتی ہے۔ اگر فرد کی سیرت پختہ ہو جائے تو مِلّت خود بخود اس مقام پر فائز ہو سکتی ہے۔ جو زندہ قوموں کا مقام ہوتا ہے۔

علاّمہ اقبال کے سامنے قوم کی وہ حالت زار تھی جسے بیان کرتے ہوئے اُنھوں نے فرمایا۔

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

اس حالت میں قوم پر فطری طور پر جمود طاری تھا۔ اسی لئے علاّمہ اقبال

قوم کی اس حالت کے بارے میں زیادہ پریشان تھے۔ وہ اس جمود و خمود کی روایات کو پگھلا کر حرکی تصوّرِ حیات پیش کرنا چاہتے تھے جسے اُنھوں نے تمام تفصیلات کیساتھ اپنے کلام اور اپنے لیکچروں میں پیش کیا ہے۔

علاّمہ اقبال کے لیکچر اس اعتبار سے بہت بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان میں اُنھوں نے جدید ذہن کیلئے ایک فکری اساس مہیّا کی ہے۔ ان میں اُنھوں نے وہی زبان اختیار کی ہے جو آج کے ذہن کو اپیل کر سکتی ہے اور عصری ضروریات کے مطابق ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ علاّمہ اقبال ایک خاص قسم کے صوفی و ملاّ کی ناخوش اندیشی سے نالاں ہیں۔ علاّمہ اقبال مسلمانوں میں پھر فکری روایات زندہ کرنا چاہتے تھے اور اِنھی فکری روایات کے ذریعے مسلمانوں کا احیاء چاہتے تھے۔ علاّمہ اخلاقی، فکری اور علمی حیثیت سے فتوحات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ علاّمہ اقبال کا واضح نظریہ ہے کہ نورِ فکر اور نورِ ایمان کے بغیر قومیں زندہ لاشیں ہوتی ہیں۔

اس لئے میں آپکی خدمت میں مشورہ پیش کرتا ہوں کہ علاّمہ اقبال کے لیکچروں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے۔ اُنھیں بار بار پڑھا جائے۔ آپ محسوس کریں گے کہ وہ نایاب دوست ہیں۔

قائدینِ ملّت اقبال کا معیار

پروفیسر ڈاکٹر محمّد باقر

قائدینِ ملّت۔ اقبال کا معیار

یہ صرف ایسے اشخاص ہو سکتے ہیں جنہیں اسلام کے مقاصد اور تاریخ کے عصری تقاضوں کا شعور ہو۔

۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے الہ آباد کے اجلاس کے صدارتی خطبہ میں علامہ اقبال نے اس بات پر زور دیا تھا کہ فرقہ وارانہ مسائل کا مستقل حل یہ ہے کہ برطانوی ہند کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے مسلمانوں کو یہ اہم بات سمجھائی تھی کہ وہ واقعات کی رفتار پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کی تیاری کریں۔ بدقسمتی سے اِن کے خطبے کا یہ حصّہ گمنامی اور بے توجہی کی نذر ہوگیا حالانکہ علاّمہ اقبال کی تجویز کا ایک حصّہ مکمل ہو جانے یعنی قیام پاکستان کے بعد اہلِ پاکستان کیلئے لازم تھا کہ اِن کوتاہیوں کو پیشِ نظر رکھیں جن کی طرف اس زمانے کے مسلمان مفکروں نے اشارے کئے تھے اور جن کی بنا پر علاّمہ مرحوم نے فرمایا تھا کہ مجھے صفائی کے ساتھ یہ بات کہنے دیجئے

کہ ہندی مسلمان آج دو خرابیوں سے دوچار ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ قوم میں قحط الرجال ہے۔ حضرت علامہ نے دو ہمعصر انگریز حکام یعنی سرمالکم ہیلی اور لارڈ ارون کے قول کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا کہ ان دو انگریزوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے خطاب کرتے وقت بالکل ٹھیک کہا تھا کہ اب مسلمان قوم قائد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوگئی ہے۔ اسی نکتے کی مزید تشریح کرتے ہوئے علامہ اقبال نے لفظ قائد کی تعریف ان الفاظ میں کی:

"میرے نزدیک مسلمانوں کے قائد وہ لوگ ہیں جو خدا داد طاقت اور اپنے تجربوں کی بدولت اسلام کی روح اور مقاصد اسلام کا شعور رکھتے ہوں۔ نیز تاریخ کے عصری تقاضوں سے بھی باخبر ہوں۔ یہی لوگ قوم کی روح رواں ہوتے ہیں۔ انھیں خدا کا عطیہ سمجھنا چاہیئے کیونکہ اس قسم کے آدمی اپنی مرضی سے پیدا نہیں کئے جاسکتے۔"

علامہ اقبال زندگی بھر نہایت خلوص سے قائدوں کی ان خصوصیات کا اعلان کرتے رہے وہ ان اشخاص کو کہیں مردِ حُر، کہیں مردِ کامل، کہیں مردِ حق آگاہ اور کہیں بندۂ مومن کے خطاب سے یاد کرتے تھے۔ ایسے اشخاص کے متعلق وہ اپنے ہی اشعار میں جابجا اشارے کرتے ہیں۔

چناں با ذات حق خلوت گزینی
ترا او بیند و او را تو بینی
بخود محکم گذر اندر حضورش
مشو ناپید اندر بحر نورش

حفظ قرآن عظیم آئین تست
حرف حق را فاش گفتن دین تست

(جاوید نامہ ۹۵)

دل بآیات مبین دیگر بہ بند
تابگیری عصر نو را در کمند

علامہ مرحوم نے ۱۹۲۹ء میں مدراس کے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہُوئے جو کچھ فرمایا اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک روح اسلام کے کیا معنی تھے:

"مسلمان نے ہمیشہ گرد و پیش کے لوگوں کی تہذیب و ثقافت کے عنصر کو اپنے اندر جذب کر کے اسے اپنے مذہبی نقطۂ نظر کیساتھ ہم آہنگ کر لیا۔ ہورٹن کے بقول ۸۰۰ء سے ۱۱۰۰ء تک اسلام میں تقریباً ایک سو نظام پیدا ہُوئے۔ اسلام کی فطرت میں قدرت نے جو لچک رکھی ہے اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا۔ اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اوّلین مسلم مفکّر کبھی غور و فکر سے خالی نہیں رہے۔ مسلمانوں کے ادبیات اور افکار کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کی بدولت یہ یورپی مستشرق یعنی ہورٹن جو نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہُوا وہ یہ تھا" روح اسلام اتنی وسیع و عمیق ہے کہ عملی حیثیت سے اسے بیکراں تسلیم کرنا پڑے گا۔ ملحدانہ نظریات کے سوا اس نے گرد و پیش کے لوگوں کے تمام صالح نظریات کو جذب کر کے

اُنھیں اپنی مخصوص ارتقائی سمت عطا کی۔"

علاّمہ نے مسلمان کے حقیقی قائد کے اوصاف میں یہ صفت بھی شامل کی ہے کہ اسے اسلام کے مقاصد کا صحیح شعور و ادراک حاصل ہو۔ اُنھوں نے اپنے اشعار نیز خطبات وغیرہ میں اس موضوع کی جابجا وضاحت کی ہے اور اِن بے پایاں امکانات سے بحث کی ہے جو قرآن حکیم میں پوشیدہ ہیں۔ خطبات میں ایک اور جگہ اُنھوں نے یہ اشارہ کیا ہے کہ:

"قرآن کا (بلکہ یوں کہئیے کہ اسلام کا) خاص مقصد ہی یہ ہے کہ ذاتِ خداوندی اور کائنات کے ساتھ انسان کے جو تعلقات و روابط ہیں اِن کا صحیح شعور انسان کے دل میں پیدا کرے۔ قرآنِ حکیم کی ان بُنیادی اور لازمی تعلیمات کے اسی پہلو سے متاثر ہو کر ایک مرتبہ گوئٹے نے ایکرمین سے ایک عمومی تبصرہ کے ضمن میں کہا تھا۔ کہ یہ تعلیم ہمیشہ کامیاب رہتی ہے۔ ہم یا اور کوئی قوم اپنی تمام فکری رفعتوں کے باوجود اس سے بہتر تعلیم پیش نہیں کر سکتے۔"

(خطبات۔ صفحہ ۹)

آئیے اب اس دوسری خرابی پر غور کریں جو علاّمہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کو تباہ کر رہی تھی۔ الہ آباد کے ۱۹۳۰ء والے اسی خطبے میں اُنھوں نے فرمایا:

"دوسری خرابی جس میں ہندوستان کے مسلمان مبتلا ہیں یہ ہے کہ ان کا باہمی اتحاد اور یکجہتی بہت تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ اس انتشار کے ہاتھوں یہ حال ہو گیا ہے کہ ان کے افراد اور مختلف گروہ مِلّت کے فکر و عمل کی بہبود

نسے عاری ہو کر بہت بیباکی سے اپنے اپنے راستوں پر چل کھڑے ہُوئے ہیں۔"

قومی اتحاد اور یک جہتی پر علاّمہ اقبال نے سینکڑوں اشعار لکھے ہیں اُنھوں نے جابجا ان افراد کی مذمت کی ہے جو ذاتی نفع کی خاطر یا انفرادی مقاصد کے حصول کے لئے فلاح قوم کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یک جہتی اور ہم آہنگی کا درس دینے کے ساتھ ساتھ اس دَور میں علاّمہ اقبال ایک آزاد اسلامی مملکت کا تصوّر بھی قائم کر رہے تھے۔ اب اُنھیں عالمِ فانی سے گزرے ہُوئے تیس سال ہو گئے۔ اکیس[۲۱] سال ہُوئے کہ ان کا سنہری خواب یعنی پاکستان بھی عالمِ وجود میں آچکا ہے۔ قدرتاً یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کے اس محسنِ اعظم نے جو تصورات پیش کئے تھے۔ اُنھیں عملی جامہ پہنانے کیلئے ہم نے کیا کچھ کیا ہے؟ نیز اِن کے خیالات کی کسی حد تک پیروی کی ہے؟ مسلمان اپنی قوم کے قائد میں جو صفات دیکھنا چاہتے ہیں علاّمہ نے اُنھیں وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ آپکو بھی غالباً اس سے اتفاق ہوگا کہ خوش قسمتی سے ہمیں ایسے قائد ضرور ملے جن میں خداداد قائدانہ صلاحیتیں تھیں۔ نیز ان کی صلاحیت کو تجربے نے بھی پختہ کر دیا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم ہرگز پاکستان حاصل نہ کر سکتے۔

اس معیار کے مطابق قائدِ اعظم محمّد علی جناح ہمارے بہترین اور سب سے قابل رہنما اور قائد تھے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ قائدِ اعظم کے علاوہ ہمارے دوسرے قائد بھی اسلام کی رُوح اور مقاصد عالیہ سے روشناس تھے۔ اس کے دوش بدوش اُنھیں موجودہ تاریخ کے رجحانات کا بھی پُورا شعور تھا۔ با این ہمہ

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حصولِ پاکستان کے بعد کچھ ایسے اسباب ضرور پیدا ہوئے جن کے باعث ہم ان مقاصد سے ہی منحرف ہو گئے جن کیلئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ان مقاصد عالیہ کو جناب جسٹس حمود الرحمٰن صاحب نے "آئین پر ایک نظر" کے عنوان سے پاکستان ٹائمز کی یکم اپریل و دوم اپریل ۱۹۶۸ء والی اشاعتوں میں نہایت صحت اور وضاحت سے بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ مطالبۂ پاکستان سے برصغیر کے مسلمانوں کا مقصود یہی تھا کہ "ہمیں ایک ایسا خطۂ زمین مل جائے جہاں ہم اسلام کی تعلیم اور تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں"۔

اس مقصود و مدعا کے حصول میں جو چیز حائل ہو گئی وہ غالباً یہ تھی کہ یک جہتی اور ہم آہنگی کا وہ جذبہ جو حصول پاکستان سے پہلے مسلمانوں کے دل میں موج زن ہو کر ان کی روح کو سرشار کر رہا تھا پاکستان بننے کے بعد کسی حد تک کمزور ہو گیا۔ واضح رہے کہ یک دلی اور ہم آہنگی کا جذبہ مجرد صورت میں باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ دراصل ملّت کی امنگوں اور عزائم کا ترجمان ہوتا ہے۔ اور معاشرے کی مادی، اخلاقی اور روحانی فضا کے بہتر یا بدتر ہونے کے ساتھ بتدریج بڑھتا رہتا ہے یا زوال پذیر ہو جاتا ہے۔

یہ جذبہ عروج پر ہو تو افراد قوم میں اتحاد و اخوّت پیدا کرتا ہے، وہ اپنے قائد کا احترام کرتے ہیں اور اپنی انفرادیت کے قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ باہم متحد رہتے ہیں۔ اپنے خاندان قبیلے یا جماعت کی انفرادیت قائم رکھنے کے باوجود ان میں اتحادِ فکر اور اتحادِ مقصد کا جذبہ کار فرما رہتا ہے۔ جسٹس حمود الرحمان صاحب نے پاکستان کے مسلمانوں کے حالات کا تفصیلی جائزہ لے کر انھیں یہ امید افزا پیغام دیا ہے کہ:

"جب یک جہتی و ہم آہنگی کے جذبے سے ہر قسم کے افراد ایک مرکز پر جمع ہو کر اتحاد و اخوت کے دائرے میں آسکتے ہیں تو اہل پاکستان کا متحد ہو جانا بھی مشکل نہیں۔ ہمارا ایک ہی مذہب ہے۔ ہماری روحانی اور ثقافتی میراث مشترک ہے اور نظریاتی مملکت کے متعلق ہماری اُمنگیں یکساں ہیں۔ میں ہرگز یہ بات تسلیم نہیں کرسکتا کہ پاکستان کے دو حصّوں کے باشندوں میں کوئی قدر مشترک نہیں البتہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ دونوں حصّوں کے باشندے ہمدردی اور مفاہمت سے کام لے کر ایک دوسرے کی خواہشات کا احترام کریں اور دونوں حصّوں کی اقتصادی رفتار ترقی میں جو نمایاں فرق ہے اور جس کی وجہ سے دلوں میں بے اطمینانی پیدا ہو کر احساس محرومی کی صورت اختیار کر رہی ہے اسے دور کرنا چاہیئے"

معاشی مساوات کا یہ نسخہ جو جسٹس صاحب موصوف نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے باشندوں کو متحد کرنے کیلئے تجویز کیا ہے یقیناً نہایت مفید اور کارگر ہے۔ تاہم راقم کا خیال ہے کہ معاشی عدم مساوات جس کے ہاتھوں بعض اشخاص بے حد نادار یا بعض بہت زیادہ مالدار ہو گئے ہیں۔ پورے پاکستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ لہٰذا مناسب یہ ہوگا کہ معاشی مساوات جاری کرنے کا یہ اصول تمام افراد اور تمام جماعتوں پر نافذ کیا جائے۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں متحدہ قومیت، یک جہتی، ہمدردی اور ہم آہنگی کے جذبات نشو و نما پائیں گے جسٹس صاحب موصوف کے حکیمانہ دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ:

"منصوبے کے مطابق دونوں حصّوں کی معاشی ترقی کے ساتھ ملّی اتحاد اور قومی یک جہتی کے تازہ احساس کی تولید اور ارتقاء ایک لابدی شئے ہے اور اسی سے سیاسی استحکام کا راستہ بھی ہموار ہوگا۔"

۲۰

اقبال — دیدہ و شنیدہ!

پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللہ
چیئرمین اردو دائرۂ معارف اسلامیہ
پنجاب یونیورسٹی

اقبال - دیدہ و شنیدہ!

علاّمہ اقبالؔ کا مکان، زیارت کدۂ خاص و عام تھا۔ میں بھی از راہِ عقیدت حاضر ہُوا کرتا تھا ۔۔۔۔۔۔ لیکن ایک خاموش اور حیرت زدہ طالبعلم کی حیثیت سے ۔۔۔۔۔! شکوہ، جوابِ شکوہ اور دوسری نظمیں سیّد عبدالقادر کی کتاب، جذباتِ قومی[1] میں پڑھ چکا تھا۔ خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام خود حکیم الامّت کی زبان سے سُن چکا تھا۔ عقیدت محبّت کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ مگر طبعی حجاب کے باعث نہ کبھی اپنے آپ کو نمایاں کیا۔ نہ بحث میں حصّہ لیا۔ بس شرکت کرلیا کرتا تھا۔ اور جو گفتگو ہوتی سُن لیا کرتا تھا۔ ضبط

---

(۱) سیّد عبدالقادر، اسلامیہ کالج لاہور میں تاریخ کے پروفیسر تھے بڑے دردمند بزرگ تھے، اُنھوں نے قومی نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا۔ (جذباتِ قومی) میں سب سے پہلے، اُردو کی قومی شاعری سے، اُنھیں نظموں کے طفیل متعارف ہُوا تھا۔ مجھے سالِ طباعت یاد نہیں لیکن ۲۳-۱۹۲۲ء کا زمانہ تھا۔

کرنے کی کوشش بھی کبھی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ملفوظاتِ اقبال کی کوئی قسط شائع نہیں کی، چند واقعات دید و شنید کے طور پر حافظے میں نمایاں طور پر محفوظ ہیں۔ یہ تاثرات محض بطور امتثالِ امر، پیش کر رہا ہوں ورنہ میرے لئے یہ بھی باعثِ ندامت ہے کہ ذرہ آفتابِ تاباں سے اپنے آپکو منسوب کرے۔

- - - - - - - - - - - - - - - -

میں پہلی مرتبہ ۱۹۲۶ء کے اواخر میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا اور براہِ راست اِن سے بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ میں اس زمانے میں، پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں قلمی کتابوں کی تفصیلی فہرست بنانے پر مامور تھا۔ اور میرے کام کے نگران پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر محمدؐ اقبال اور حافظ محمود خاں شیرانی تھے۔ پروفیسر محمد شفیع نے مجھے حکم دیا کہ میں فخری بن امیری کا انتخاب شعرائے فارسی (تحفۃ الحبیب) لے کر حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوں اور انھیں وہ کتاب دکھاؤں۔ اس کتاب میں مصنف نے فارسی شاعروں کی غزلیات کو اس طریق سے جمع کیا ہے کہ مختلف شعرا کی ہم طرح غزلیں یکجا ہو گئی ہیں۔ حضرت علامہ نے مجھ سے کتاب لی اور ورق گردانی شروع کرتے ہوئے ساتھ ساتھ پنسل سے غزلیات پر نشان لگاتے گئے۔ یہ انتخابِ اشعار پروفیسر شفیع صاحب کی فرمائش پر کیا جا رہا تھا۔ شاید شفیع صاحب اس زمانے میں فارسی نصاب مرتب کر رہے تھے (جو بعد میں "سبد گل" اور "گلشن معانی" کے نام سے چھپے) اور چاہتے تھے کہ اس انتخاب میں حضرت علامہ کے ذوق کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس انتخاب میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت انھوں نے صرف کیا ہو گا۔ جب فارغ ہوئے تو مجھ سے دریافت کیا۔ بھئی فارسی کے طالب علم ہو یا عربی کے۔ عرض کیا۔ ایم۔ اے فارسی

میں گیا ہے مگر عربی مسجدوں میں پڑھی ہے۔ فرمایا عربی والا جب فارسی میں آتا ہے تو فارسی اس کے لئے مشکل نہیں رہتی، وہ فرماتے گئے، میں خاموشی سے سنتا رہا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں اُن کی باتوں کا کیا جواب دوں تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے فرمایا۔ یہ کاغذ لو اور اس پر خواجہ حافظ اور جامی کی نشان زدہ غزلیات لکھ دو جن کے مطلع علی الترتیب یہ ہیں۔

شاہ شمشاد قدان خسرو شیرین دہنان
کہ بمژگان شکند قلب ہمہ صف شکنان
(حافظ)

اے ہمہ سیم بران سنگ تو بر سینہ زنان
تلخ کام از لب مے گون تو شیرین دہنان
(جامی)

اس اثنا میں وہ گنگناتے رہے۔ جب میں لکھ چکا تو فرمایا۔ تم فارسی کے فارغ التحصیل ہو بتا سکتے ہو ان میں سے کون سی غزل اچھی ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا جواب دوں۔ بہرحال میں نے عرض کیا کہ حافظ کی غزل اچھی ہو گی۔ فرمایا، "یہ حافظ کی جادوگری ہے۔ ورنہ شیراز اور خراسان کا فرق تو واضح ہے۔ شیرازی میٹھی باتوں سے دلوں کو لبھا رہا ہے اور ہرات والا کوہستانی لہجے میں بات کہہ رہا ہے۔ اور ہم لوگوں کو اب کوہستانی لہجے کی زیادہ ضرورت ہے"۔ اس کے بعد جامی کی غزل

تحت اللفظ پڑھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شعر ان کی رگ رگ میں اتر رہا ہے۔ اس کے بعد مجھے رخصت ہونے کی اجازت دی اور فرمایا کہ پروفیسر شفیع سے کہنا مجھ سے ذرا مل لیں۔

وسط اپریل ۱۹۲۷ء میں علامہ سید سلیمان ندوی، انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں شرکت کیلئے لاہور تشریف لائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس موقع پر شہر کے اہلِ علم و ادب نے، ان کے اعزاز میں کئی مجلسیں منعقد کیں جن میں سے بعض میں علامہ اقبال بھی شریک ہوئے۔ ان کے بارے میں سید سلیمان خود لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر اقبال سے یہ میری پہلی ظاہری ملاقات تھی اور مراسلت کی باطنی ملاقات تو ۱۹۱۴ء سے قائم ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کرم کیا کہ ملنے میں پیش دستی فرمائی۔ قیام گاہ میں آئے، متعدد صحبتوں میں ساتھ رہے اور پھر خود اپنے کاشانے میں مدعو کیا۔ جس کو وہ 'دار الفقر' اور میں 'دار الاقبال' کہتا ہوں۔"

(شذرات۔ معارف مئی ۱۹۲۷ء)

اس موقعہ پر علامہ اقبال کے علاوہ، جن جن صاحبوں نے سید صاحب کے اعزاز میں دعوتوں کا اہتمام کیا اور ان کے نام شذرات میں بھی ہیں یہ ہیں: مولانا ظفر علیخان، مولانا تاجور، پروفیسر سراج الدین آذر، مولوی سید ممتاز علی، اور خواجہ محمد سلیم (جن کا نام شذرات میں خواجہ سلیم الدین لکھا)۔

سید سلیمان ان صحبتوں کے متعلق لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر اقبال ان تمام صحبتوں میں شمع محفل تھے، اُنھوں نے تو شمع اور شاعر لکھا ہے لیکن میں نے تو لاہور میں خود شاعر کو شمع دیکھا اور قدر شناسوں کو اس کا پروانہ پایا۔ ان کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بہت بلند کر رہی ہے۔ ان کے فلسفیانہ نکات، عالمانہ افکار، شاعرانہ خیالات ان کی آس پاس کی دُنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں۔ ان کی زمزمہ پردازیوں کا نیا مجموعہ، زبورِ عجم، کے نام سے عنقریب سامعہ نواز ہونے والا ہے۔ میں نے کہا کہ فلسفہ عجم کے دشمن کو مناسب بھی یہی تھا کہ عجم کے ہاتھ میں زبور دے کر ان کے خیالی فلسفہ کو مزامیر داؤد کی دعاؤں سے بدل دے۔ اور ان کے کانوں کو زبور کا، پردہ، رکھ کر قرآن کی نغمہ سنجیوں سے مانوس کر دے۔"

لاہور میں علامہ اقبال سے اپنی ملاقات کا سید صاحب نے جس شوق و محبت سے ذکر کیا ہے اس پر میرا قلم کیا اضافہ کرے گا؟ البتہ ان صحبتوں میں سے ایک کے بارے میں، اپنے تاثرات ظاہر کر سکتا ہوں، میرا اشارہ اس دعوت کی طرف ہے جو خواجہ محمد سلیم کے مکان پر ہوئی[1]۔ میں اس میں خود بھی شریک تھا۔ علامہ اقبال کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں، سید عبدالقادر، ملک لال دین قیصر، عبدالمجید سالک، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی۔

---

(۱) خواجہ محمد سلیم ایم۔ اے جو گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی کے استاد کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ اس زمانے میں، کوچہ کوٹھی داراں (کشمیری بازار) میں رہتے تھے۔

اور غالباً پروفیسر محمدؐ شفیع سراج الدّین آذر، پروفیسر محمدؐ اقبال اور پروفیسر شیرانی بھی تھے۔ ان کے علاوہ شیخ عبدالماجد، ابوالخیر عبداللّٰہ، بشیر بمبئی بوٹ ہاؤس، ملک لطیف، محمدؐ اسحاق سوز، مولوی محمدؐ امین وکیل بھی تھے۔

یہ محفل بڑی پُرلطف تھی۔ شگفتہ لطائف کے علاوہ، دقیق علمی مسائل پر بھی رواں رواں گفتگو ہوتی رہی۔ اس موقع پر خواجہ محمدؐ سلیم نے اپنا مجموعہ مخطوطات سیّد صاحب کو دکھایا۔ علّامہ اقبال بھی موجود تھے اور بعض مخطوطوں کے بارے میں سیّد صاحب سے زیادہ اُنھوں نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ مجھے خاص طور سے دو کتابوں کے متعلق گفتگو یاد ہے۔ اوّل علّامہ دوانی کا رسالہ در اثبات وجود باری تعالیٰ۔ دوسرا۔ ایک رسالہ در معنی لاتسبّو الدہر۔ کچھ رسالے نفسیات کے متعلق بھی تھے۔ جن کے متعلق کچھ یاد پڑتا ہے کہ وہ امین الدّین خاں ہروی کے رسائل النفسانیہ وسیاستہ الربانیہ تھے۔

ان میں سیّد سلیمان صاحب نے بھی بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔

اثبات وجود باری تعالیٰ کے متعلق علّامہ اقبال نے فرمایا کہ اس رسالے میں خدا کے وجود کا سب سے بڑا ثبوت سلسلہ علت و معلول بتایا گیا ہے۔ جس کی علت اولیٰ کا نام خدا ہے۔ لیکن یہ تب تک صحیح ہے جب تک علت و ملول کے سلسلے کو لوگ صحیح مانتے ہیں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ نیوٹن کی طبعیات کی رو سے فطرت کے قوانین اٹل تھے لیکن اب جدید طبیعیات ہر شئے کو طبیعیاتی طور پر اضافی ماننے لگی ہے۔ اس لئے کوئی قانون مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ اور علت و معلول کا پرانا نظام اب زائد المیعاد ہوتا جارہا ہے اس لئے دوانی کی دلیلیں اس زمانے کیلئے بے اثر ہیں۔

اس بحث میں کئی صاحبوں نے حصّہ لیا۔ جس کی جزئیات اب یاد نہیں رہتیں

لیکن اصل گفتگو سید صاحب اور علامہ کی تھی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ خدا کی ہستی کا سب سے بڑا ثبوت یہ کائنات ہے۔ علامہ نے فرمایا۔ خدا کی ہستی کا سب سے بڑا ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات ہے اور آنحضرت کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے۔ جس نے عقل، مشاہدہ اور وجدان کو جمع کر دیا ہے۔ اس کے بعد کچھ دقیق گفتگو ہوئی۔ جس کو میں سمجھ نہ سکا۔

رسالہ در معنی لاتسبّوا الدہر کے ضمن میں بڑی بصیرت افروز گفتگو ہوئی۔ سوال یہ تھا کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے (اور بظاہر اس کے صحیح ہونے میں کلام نہیں) تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ خدا اور زمان ایک شئے ہے۔ پس اگر یہ صحیح ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ خدا ہر وقت حال ہے اور وہ ہر لحظہ نیا زمان (یا نیا حال) پیدا کرتا رہتا ہے۔ علامہ نے فرمایا کہ یہ تو واضح ہوگیا لیکن یہ واضح نہ ہُوا کہ پھر مکان کیا ہے؟ علامہ نے فرمایا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے مسلمان حکما میں سے بعض کے نزدیک زمان و مکان دونوں دہر ہی کے دو نام ہیں۔ دونوں کی اصل ایک ہے۔ گویا زمان و مکان خدا کی حقیقت کے لئے دو اصطلاحیں ہیں فقط۔ سید سلیمان ندوی نے فرمایا۔ میں تو ہوالاوّل و ہوالآخر اور ہوالظاہر والباطن سے یہ قیاس کرتا ہُوں کہ زمان و مکان محض اصطلاحات برائے تفہیم ہیں۔ اصل میں جو کچھ ہے خُدا ہے۔ سیّد صاحب نے فرمایا شاید علامہ ابن قیم نے اپنی تصانیف میں اس کی کچھ تشریح کی ہے اور شاید محب اللہ بہاری کی کتاب جوہر الفرد میں بھی کچھ مل سکے۔ علامہ نے فرمایا علمائے ہند نے ان فلسفیانہ موضوعات پر خاصا غور وفکر کیا ہے۔ لیکن کوئی کتاب اس موضوع پر نہیں۔ شبلی ہوتے تو یہ کام کرتے۔ اب سید سلیمان یہ کام کریں۔

خواجہ محمد سلیم کی منعقد کردہ دعوت میں ایک مزے کا لطیفہ یہ بھی ہو گیا کہ لطائف

قدسیہ نام کی ایک کتاب پر گفتگو ہوتے ہوتے واعظ کاشفی کی کتاب لطائف الطوائف کا ذکر آ گیا۔ اس پر بڑا قہقہہ بلند ہوا اور حضرت علامہ نے فرمایا کہ "بڑے پہنچے ہوئے بزرگ معلوم ہوتے ہیں"۔ مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا۔ سیّد الطائفہ کی بزرگی سے کسے انکار ہو گا۔ کسی نے کہا طوائف طائفہ کی جمع ہے۔ کسی نے کہا۔ آج کل ، یہ جمع مفرد بن گئی ہے اور سب طائفے اس کی ذات میں سمٹ آئے ہیں۔ غرض دیر تک بذلہ سنجی ہوتی رہی ۔

لاہور میں ہم لوگوں نے ایک مجلس اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے قائم کر رکھی تھی۔ خواجہ عبدالوحید صاحب (مصنف کتابیات اقبال) اس کے سیکرٹری تھے۔ ہم نے ارادہ کیا کہ علامہ اقبال کی تعلیمات کو عام کرنے کیلئے ایک یومِ اقبال منایا جائے۔ یہ برّ اعظم ہند و پاکستان میں پہلا یومِ اقبال تھا۔ ہم اس سلسلے میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ وہ ایک شام ہوٹل شفلز (واقع مال روڈ) میں عقیدت مندوں کے ساتھ چائے پئیں۔ یہ غالباً ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس انسٹی ٹیوٹ نے دو مرتبہ یومِ اقبال منایا تھا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ء میں۔ دوسری مرتبہ اس کے بعد کبھی بیچ میں ایک مرتبہ یومِ شبلی اور دوسری مرتبہ یومِ غالب منایا گیا تھا۔ میں جس یومِ اقبال کا ذکر کر رہا ہوں وہ پہلا تھا اور شاید ۱۹۳۲ء میں منایا گیا تھا۔ اس موقعہ پر بہت سے مقالات پڑھے گئے تھے اور مسلمان عمائد شہر کے علاوہ ، ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر ، راجہ نریندرا ناتھ اور مسٹر رام چند منچندہ بھی شریک ہوئے تھے۔ بہ حال اس کے اختتام پر علامہ ہماری درخواست پر ہوٹل شفلز میں تشریف لائے اور چائے

میں شریک ہوئے اس موقع پر جو گفتگو ہوئی اس سے قطع نظر شفلز میں ان کی آمد ایک خاص شان سے ہوئی۔ مشہدی لنگی سر پر تھی۔ بند گلے کا کوٹ سیاہ رنگ کا، شلوار ٹخنوں سے ذرا اونچی۔ ایک پاؤں میں کچھ تکلیف تھی اس لئے لاہوری جوتا پہن رکھا تھا۔ جس پاؤں میں تکلیف تھی وہ جوتے کے اندر نہیں تھا۔ باہر ایک تسمے سے باندھا ہوا تھا غرض اس وضع قطع سے تشریف لائے۔ ان کی شخصیت پُر وقار تھی۔ حاضرین پر خاص اثر تھا اور علامہ کی تشریف آوری سے ہر کوئی خوش تھا۔ اس مجلس میں علامہ اقبال نے جو تقریر فرمائی مجھے کچھ زیادہ یاد نہیں رہی مگر اس کا خلاصہ کچھ کچھ یاد ہے اس میں قابل ذکر بات یہ فرمائی:-

"میں شاعر نہیں ہوں شعر شناس ہوں اور حکمت زندگی اور حکمت دین کا طالبعلم بھی ہوں۔ میری آرزو ہے کہ میں اپنے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں پر دین کے اسرار منکشف کر جاؤں تاکہ وہ دین کے قریب آ جائیں۔"

گاندھی جی نے اپریل ۱۹۳۰ء میں قانون نمک کی خلاف ورزی کے لئے تحریک کی ابتدا کی۔ اس کا ان دنوں ہر جگہ چرچا تھا۔ ایک شام بہت سے لوگ حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر تھے مکان کے باہر چبوترے پر ایک طرف کنارے پر حضرت علامہ ایک آرام کرسی پر تشریف فرما تھے۔ اور عقیدت مند ایک دائرے کی صورت، ارد گرد حلقہ زن تھے کسی نے نمک کی سول نافرمانی کا ذکر کیا۔ اس پر باتیں ہوتی رہیں اور علامہ سنتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد، حقے پر کش لگانے جاتے

اور ہُوں ہاں کرتے جاتے تھے۔ اس اثناء میں غالباً ملک لال دین قیصر نے کہا ڈاکٹر صاحب اب کانگرس اور انگریزوں کا باہمی ملاپ مشکل معلوم ہوتا ہے۔ یہ دونوں گروہ اب آپس میں کبھی مل نہ سکیں گے۔ حضرت علامہ ہنسے اور کہنے لگے قیصر، تم گاندھی اور کانگرس کو نہیں سمجھتے یہ جدائی کا اظہار بھی برائے وصل ہے اس کے بعد فرمایا۔ فارسی کا ایک شعر حسبِ حال ہے، تم اسے پیش گوئی سمجھ لو۔ پھر یہ شعر پڑھا ؎

نمک شناس اسیران چو از قفس رستند
بہ نخل خانہ صیاد آشیان بستند

اس شعر کا مجلس پر بڑا اثر ہُوا ------ اور پیش گوئی بھی صحیح ثابت ہُوئی۔ کچھ عرصے کے بعد سب نے دیکھ لیا کہ کانگرس نے وزارتیں قبول کریں ----- اور نمک شناس اسیر، نخل خانہ صیاد پر آشیاں بندی کرتے نظر آئے۔

کھُلی ملاقات کا ایک موقع مجھے اس زمانے میں مِلا جب علاّمہ اقبال مدراس لیکچرز کی تیاری کر رہے تھے۔ میں اس زمانے میں یونیورسٹی لائبریری میں بیٹھتا تھا اور مخطوطات کی فہرست سازی پر مامور تھا۔ یا شاید ریسرچ سکالر تھا۔ مجھے پیغام مِلا کہ لائبریری میں فلسفہ کی عربی و فارسی کی جو کتابیں ہیں ان کی فہرست بنا کر حاضر کروں ---- جب میں حاضر ہُوا تو فرمایا "مسلمانوں میں دین والا آدمی جب فلسفے کی اصطلاحوں میں بات کرتا ہے تو اس کی بات میں وقار اور وزن پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر محض فلسفے والا آدمی جب دین کی بات کرتا ہے۔ تو اس کی نہ

فلسفیانہ حیثیت ہوتی ہے نہ دینی لحاظ سے اس میں وزن ہوتا ہے۔ میری بے علمی مانع رہی۔ اس کیوجہ سے میں خاموش رہا۔ دراصل میں سننے والوں میں تھا اور میرے لئے یہی کافی تھا کہ میں ایک حکیم بالغ نظر کے پاس بیٹھا ہوں۔ اور کچھ سن رہا ہوں۔ اس کے بعد مجھے عربی کا ایک رسالہ دیا۔ اس کے شروع میں ایک کاغذ رکھا تھا جس پر صفحات کی نشاندہی کی ہوئی تھی۔ مجھ سے فرمایا کہ مولانا غلام مرشد کو یہ رسالہ دے آؤ۔ اور یہ بھی کہہ دینا کہ ترجمہ جلد کر بھیجیں میں نے تعمیلِ ارشاد کی۔

بالِ جبریل تازہ تازہ چھپی تھی (۱۹۳۵ء) اس کے برجستہ اشعار اہلِ درد کی زبان پر تھے۔ کچھ اشعار ایسے بھی تھے جو بڑے دل پسند تھے مگر ان کے مفہوم میں کچھ اُلجھنیں بھی تھیں۔ ایک شام علامہ کے مکان پر عقیدت مندوں کا جمگھٹا تھا۔ مختلف موضاعات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کسی نے بالِ جبریل کا ذکر چھیڑا۔ اس کے دوران میں غالباً ڈاکٹر تاثیر نے کہا۔ قبلہ! بالِ جبریل کا ایک شعر بہت پریشان کر رہا ہے آپ سے اس کی تفسیر کی تمنا ہے ؎

محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

ڈاکٹر تاثیر نے کہا۔ دوسرا مصرع، خصوصاً اس کے الفاظ "یہ حرفِ شیریں" اُلجھن میں ڈال رہے ہیں۔

علامہ نے فرمایا۔ شعر تو صاف ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ "یہ حرفِ شیریں" کے الفاظ سے اُلجھن ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر یہ کی ضمیر پر غور کیا جائے تو بات واضح

ہو جاتی ہے کہ اس ضمیر کا مرجع قریب لفظ قرآن ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہُوا کہ۔

"اے خدا یہ صحیح ہے کہ محمدؐ اور جبریل اور قرآن تیرے ہیں یعنی محمدؐ تیرے رسول ہیں، جبریل تیرے فرشتے ہیں اور قرآن تیرا کلام ہے۔ مگر یہ تو بتا کہ حرفِ شیریں (قرآن) ترجمانی کس کی کر رہا ہے۔ میری یا تیری (انسان کی، خدا کی)

اس کے بعد حضرت علاّمہ نے قرآنِ حکیم پر بصیرت افروز تقریر کی اور فرمایا کہ قرآن حکیم کلام تو خُدا کا ہے۔ لیکن دُنیا کی سب سے بڑی کتاب الانسان بھی یہی ہے۔ یعنی انسان کی نفسیات، اس کے کوائف، اس کی نیکیوں، اس کی بغاوتوں اس کی مجبوریوں اور اس کی فضیلتوں ...... قوموں کی اجتماعی خصلتوں اور رعادتوں اُمم سابقہ کے تجربوں اور اُمم آئندہ کیلئے بصیرتوں کے علم کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب انسان اور امورِ انسانی ہی کی سرگذشت ہے۔ خُدا کیا ہے اور کیا کرتا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے۔ مگر اس سے زیادہ اس میں یہ ہے کہ انسان کیا ہے اور کیا کرتا ہے۔ اس کا نصب العین کیا ہے۔ اس کے نیک و بد اور فلاح و اصلاح کی جو ترجمانی قرآن نے کی ہے اور کہیں نہیں ملتی۔ علاّمہ اقبال نے فرمایا شعر کا مصرع ثانی بظاہر استفہام ہے۔ لیکن دراصل اس کا مقصود اثبات ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ ہر چند محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلّم تیرے مرسل، جبریل تیرا فرستادہ اور قرآن تیرا کلام ہے مگر یہ ترجمان انسان کا ہے۔ اس کے پردے میں انسان ہی کی کامل تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس کا مقصود و مطلوب انسان ہی ہے، یہ مفہوم علاّمہ اقبال کے

بہت سے اور اشعار میں بھی ہے۔ جن میں انسان کو مطلوب و مقصود ٹھہرایا گیا ہے
شرفِ انسان کے بارے میں زبورِ عجم کی ایک غزل خاص طور سے مدّنظر رہے
اس کا مطلع یہ ہے ۔

ما از خدائے گمشدہ ایم او بہ جستجواست
چون ما نیازمند و گرفتار آرزواست

اور مقطع یہ ہے ۔

در خاکدان ما گہرِ زندگی گم است
آن گوہرے کہ گمشدہ مائیم یا کہ اوست

- - - - - - - - - - - - - - - - -

یہ چند واقعات محض بطور تذکرہ و تبرک لکھے ہیں ورنہ ان کی اشاعت کی ضرورت نہ تھی۔ البتہ مجھے اس بہانے سے یہ عرض کرنے کا موقع مل گیا ہے کہ اقبالیات پر کام کے وسیع میدان کھلے ہیں۔ آج تک اقبال پر اور ان کے کلام کے مختلف موضوعات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر اقبالیات کا موضوع ابھی تک تشنہ ہے۔ درحقیقت ابھی تک مطالعہ اقبال کی تحریک صحیح معنوں میں شروع ہی نہیں ہوئی، وجہ اس کی یہ ہے کہ اقبال شناسی اور اقبال فہمی کے لئے کئی علوم کی ضرورت ہے۔ مشرق و مغرب کے عام علوم کے ساتھ اسلامی علوم بھی سیکھے جائیں تو بات بنتی ہے محض جدید تعلیم صحیح اقبال شناسی پیدا نہیں کر سکتی۔

میری رائے میں قابلِ توجہ امور جن پر اقبالیات کے بارے میں کام کرنا باقی ہے، یہ ہیں۔

(۱) اقبال کے ماخذ کا مسئلہ

(۲) اقبال کے اہم موضوعات کی عالمانہ تعبیر کا مسئلہ

(۳) اقبال کے علم کلام کی تدوین کا مسئلہ

یہ بھی اہم ہے کہ پاکستان کے نصب العین تک پہنچنے کیلئے فکر اقبال سے استفادہ کس طرح کیا جائے۔ اسی طرح ایک ایسی فکری تحریک کی بھی ضرورت ہے جس کا منبع فکر اقبال ہو۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہو کہ اس ملک میں اسلامی طرزِ فکر اور طرزِ حیات کو فروغ دیا جائے اس کے علاوہ اسلامی قانون کی تشکیل نو بھی ایک لازمی فریضہ ہے اور یہ آخری معاملہ قوم کی خاص توجہ چاہتا ہے۔ اقبال پر کام کرنے والی مجالس کا فرض یہ ہے کہ وہ لوگوں میں صحیح تحقیقی ذوق پیدا کریں، محض جذباتی انداز کی اقبال پرستی کافی نہیں، کام علمی بنیادوں پر ہونا چاہیئے۔ اور محبت ہر حال میں رفیق حال اور شریک کار اور توفیق میرے رب کے ہاتھ میں ہے۔

- - - - - - - - - - - - - -

اقبال کا نظریۂ تعلیم
مشاہدات کی روشنی میں

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی
۱۵-ایف، گلبرگ - لاہور

اقبال کا نظریۂ تعلیم

(مشاہدات کی روشنی میں)

اقبال کے نظریۂ تعلیم پر چند مشاہدات مختصر طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں جو میں نے خود اقبال کی صحبت میں رہ کر تجربہ اور مشاہدہ کئے ہیں، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ علامہ اقبال کے نزدیک تعلیم اور تعلّم کا مفہوم کیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے علاّمہ اقبال جب کبھی موجودہ نظام تعلیم پر گفتگو کرتے، یا اس ضمن میں تعلیمی حالات پر تنقید یا تبصرہ فرماتے تو عام طور پر یہی نتیجہ نکلتا کہ ان کے زمانے کا نظامِ تعلیم جو آج بھی عہدِ انگلشیہ کی میراث کے طور پر ایک طرح سے جاری ہے، ان کے نظریۂ خودی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ یا تو آپ کے نظریات کا عنصر اس میں بالکل معدوم ہے اور یا ان کے نقطۂ نظر کو یہ نظامِ تعلیم حاوی ہو ہی نہیں سکتا۔ اگرچہ قیام پاکستان کے بعد اسلامیات کی تعلیم پر خاصی توجہ دی جا رہی ہے۔ لیکن اس صورتِ حال میں کوئی بنیادی تبدیلی ظہور میں نہیں آئی۔

علامہ اقبال خود بھی اعلیٰ تعلیم سے آراستہ تھے، آپ نے یہ تعلیم سیالکوٹ و لاہو کی حدود سے نکل کر یورپ کی اعلیٰ درسگاہوں کیمبرج (انگلستان) اور میونخ (جرمنی) میں حاصل کی اور اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد پنجاب کی مشہور ترین درسگاہ گورنمنٹ کالج لاہور میں بطورِ معلّم فلسفہ و انگریزی پڑھاتے رہے۔ اس سے پہلے ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۲ء تک وہ اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے تدریسی اور تصنیفی خدمات انجام دے چکے تھے ابتدا میں آپ نے سیالکوٹ میں اپنے شفیق اُستاد شمس العلما سیّد میر حسن سے اسلامی روایات کے نمونے پر تعلیم حاصل کی۔ آپ علامہ سیّد میر حسن کے بارے میں کہا کرتے تھے:۔

مجھے اقبال اس سیّد کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

جب آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں آئے تو آپ ایک دُوسرے فاضل اُستاد سر ٹامس آرنلڈ کے دامنِ تربیت میں آئے۔ جن سے آپ اس قدر متاثر ہوئے کہ جب وہ ہندوستان میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن انگلستان واپس چلے گئے، تو ایک طویل نظم اس غیر ملکی اور غیر مسلم اُستاد کی یاد میں بعنوان "نالۂ فراق" لکھی۔ جس میں فرماتے ہیں۔

تو کہاں ہے اے کلیمِ ذروہ سینائے علم
تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائی صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

اس طویل نظم کے مندرجہ بالا دو اشعار کے علاوہ ہر شعر سے صاف ظاہر ہے

کہ علوم کی قدر دانی کے سلسلے میں اقبال کے دل میں اس فرنگی استاد کی تربیت اور صحبت نے کتنا گہرا اثر ڈالا تھا۔ اُنھیں اس کا احساس بھی تھا۔ علوم کی تحصیل اور اساتذہ کی یاد میں قصائد کی ہماری تاریخ میں بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ حدیث نبوی کے مطابق ہمارے اس نظریۂ تعلیم "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" کی اس سے بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے اس سلسلے میں حضرت علی کا قول ہے کہ "من تعلم حرفاً من احد وھو مولاہٗ" یعنی جس نے کسی سے ایک لفظ بھی پڑھ لیا تو وہ اس کا مولا ہے۔ یہ ہے اُستاد کا بلند درجہ اور علم اور معلّم کی قدر دانی، اور یہ نظریہ محض اسلام ہی نے پیش کیا ہے۔

علامّہ اقبال جب ۱۹۰۵ء میں تحصیل علمی کیلئے یورپ تشریف لے گئے تو وہاں پر آپ نے اس طریقۂ تعلیم کی کمی محسوس کی جسے اسلام پیش کرتا ہے اور اس وقت کے نصاب کو دیکھ کر ایک نظم بعنوان "علی گڑھ کالج کے نام" لکھی جس کا یہ شعر خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا
اس کا مقام اور ہے۔ اس کا نظام اور ہے

یہ وہ حقائق ہیں جن سے اقبال کا اپنا نظریہ تعلیم خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔
اس سے بڑھ کر ایک علمی شہادت اور بھی ملتی ہے، جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں، مسلمان بچوّں کی اعلیٰ تعلیم اور اس کے نصاب پر گفتگو کا موقع آیا، تو اس وقت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ایک خاکہ "علومِ اسلامیہ" کے عنوان سے تیار کیا۔ جب آپ نے علامّہ کے پاس برائے اصلاح و مشورہ

ارسال کیا۔ علامہ اقبال نے اس پر ایک مفید نوٹ بصورت مفید اشارات لکھ کر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے پاس ارسال کیا۔ جو علی گڑھ کے مجلہ "سہیل" اپریل ۱۹۲۶ء میں صد ا ۔۔۔۔۔۔ ۲۰ پر طبع ہو چکا ہے۔ یہ علمی مجلہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ادارت میں طبع ہوتا تھا۔ اس کی طباعت کا انتظام بھی میں ہی لاہور میں کیا کرتا تھا۔ علامہ کا نظریۂ تعلیم اسی نوٹ کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے واضح ہو جائے گا۔ لکھتے ہیں:

"مائی ڈیر صاحبزادہ صاحب!

میں نے علومِ اسلامیہ کے متعلق آپکے نہایت عمدہ نوٹ کا بہت دلچسپی کیساتھ مطالعہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے اس پر بہت کچھ غور کیا ہے۔ اسی مضمون پر مختلف نقطۂ نظر بالخصوص جدید دُنیائے اسلام میں عالمگیر روحِ انسانیت (HUMANISM) کی تخلیق بلکہ بیداری کے لحاظ سے نگاہ ڈالنی چاہیئے۔ بہرحال قبل اس کے کہ میں کچھ عرض کروں میں چند منتشر خیالات جو میرے ذہن میں آئے، علوم اسلامیہ کے سلسلے میں بیان کروں۔۔۔۔۔۔"

یہ تحریر خاصی طویل ہے، تاہم مندرجہ ذیل اقتباس اسی ضمن میں علامہ کا نقطۂ نگاہ واضح کردے گا۔

"یورپ میں اسلام کا سیاسی زوال، بدقسمتی سے کہا جا سکتا ہے۔ ایسے وقت رونما ہوا جب مسلم حکما کو اس کی حقیقت کا احساس ہونے لگا تھا، کہ استخراجی علوم لایعنی ہیں اور جب وہ استقرائی علوم کی تعمیر کی طرف کسی حد تک مائل ہو چکے تھے۔ دُنیائے اسلام میں تحریک دینی عملاً اس وقت سے مسدود ہو گئی ہے۔

اور یورپ نے مسلم حکماء کے غور و فکر کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہونا شروع کیا۔ یورپ میں جذبۂ انسانیت کی تحریک بڑی حد تک ان فنونوں کا نتیجہ تھی، جو اسلامی فکر سے برقے کار آئی۔ یہ کہنا مطلق مبالغہ نہیں ہے کہ جدید یورپین جذبۂ انسانیت کا جو ثمر جدید سائنس اور فلسفہ کی شکل میں برآمد ہوا ہے، اسے کئی لحاظ سے محض اسلامی تمدن کی توسیع پذیری کہا جا سکتا ہے۔ اس اہم حقیقت کا احساس نہ آج کل کے یورپین کو ہے۔ اور نہ مسلمان کو۔ کیونکہ مسلمان حکماء کے جو کارنامے محفوظ ہیں، وہ ابھی تک یورپ، ایشیا، افریقہ کے کتب خانوں میں منتشر اور غیر مطبوعہ شکل اور حالتوں میں ہیں۔ آج کل مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ بڑی حد تک ان کے تمدن سے برآمد ہوا ہے۔ وہ اسے بالکل غیر اسلامی تصوّر کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی مسلم حکیم کو یہ معلوم ہو کہ آئینسٹائن کے نظریہ سے کس قدر ملتے جلتے خیالات پر اسلام کے سائنٹفک حلقوں میں سنجیدگی سے بحث مباحثے ہوتے تھے (ابو المعالی جس کا قول ابن رشد نے نقل کیا ہے) تو آئینسٹائن کا موجودہ نظریہ ان کو اتنا اجنبی نہ معلوم ہو۔ اس کے علاوہ جدید استقرائی منطق سے اسے جو بیگانگی ہے وہ بہت کچھ کم ہو جائے اگر اس کو یہ معلوم ہو کہ جدید منطق کا تمام نظام رازی کے ان مشہور و معروف اعتراضات سے وجود میں آیا، جو انھوں نے ارسطو کے استخراجی منطق پر عائد کیے تھے۔ اس قسم کے عالموں کا تیار کرنا از بس ضروری ہے۔ کیونکہ جدید علم کے اخذ و جذب کرنے میں صرف یہی لوگ مدد کر سکتے ہیں......"

علاّمہ اقبال کا یہ طویل نوٹ واضح کرتا ہے کہ ایک مسلم یونیورسٹی میں کس قسم کی تعلیم ہونی چاہیئے۔ اس کے علاوہ علاّمہ نے دسمبر ۱۹۱۱ء میں بھی آل انڈیا محمڈن

ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر اپنے اِن خیالات کا اظہار کیا تھا۔ آپ نے اس کانفرنس میں علامہ شبلی کی دعوت پر شرکت کی اور اس جلسہ میں امام فخرالدین رازی کے حوالہ سے ارسطو کی منطق کی شکل اوّل پر اعتراض کیا تھا۔ اس وقت مولانا شبلی نے آپکو ملک الشعراء کا خطاب بھی دیا تھا۔ اس واقعہ کو سیّد سلیمان ندوی نے بھی حیاتِ شبلی میں لکھا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک یہ ایک اصولی امر تھا۔ میرے نزدیک ایک طرح سے یہ رومن کلچر اور تاریخ پر علامہ کا بہت بڑا براہِ راست اعتراض تھا۔ اور اس طرح اُنھوں نے تمام یورپی نظریۂ تعلیم پر اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کی تھی۔ غرضیکہ آپ یہ چاہتے تھے کہ کم سے کم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں صحیح معنوں میں اسلامی نظریاتِ تعلیم کا نفاذ ہو۔ اور باقی مسلم ادارے خود بخود اس کی تقلید کریں گے۔

یہاں یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آج تمام امریکن اور یورپی یونیورسٹیوں میں بھی ایک مضمون بعنوان (Humanities) یعنی انسانیت یا بشریت رائج ہو چکا ہے۔ خواہ یونیورسٹی کا موضوع تعلیم علمی سائنس ہی کیوں نہ ہو۔ اگرچہ اسے مذہبی تعلیم کا نام تو نہیں دیا جا سکتا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ان یونیورسٹیوں کے لادینی ماحول میں یہ ایک دینی درجۂ تعلیم کے مترادف ہے اور یہ خالصتاً اسلامی نظریۂ تعلیم کا پس منظر ہے۔ یعنی طالب علم میں بجائے خشونت کے جذبۂ شفقت پیدا ہو۔ جسے اقبال نے بنی نوع کی نجات کا باعث تصوّر کیا ہے اور یہی متذکرہ بالا نظریہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور علامہ اقبال کے مابین مذاکرات کا موضوع ہے۔

اس کے چند سال بعد جب علامہ اقبال کو ۱۹۲۸ء کے آخیر میں مدراس کے دوراندیش سیٹھ جمال محمّد نے لیکچروں کی دعوت دی اور عنوان یا موضوع خطبات

کو اقبال پر چھوڑ دیا تو اس کے جواب میں آپ نے چھ لیکچر لکھے۔ جب علامہ دسمبر کے مہینہ میں ایک دعوت پر مدراس تشریف لے گئے۔ تو بندہ کو بھی آپکی مصاحبت کا شرف حاصل ہوا، اور ان لیکچروں کی تیاری میں بھی حصہ لیا۔ اقبال نے ابھی تک تین لیکچر لکھے تھے۔ یہ لیکچر شہر مدراس، میسور اور بنگلور بلکہ اس کے فوراً بعد حیدر آباد دکن میں بھی دیئے گئے۔ ان لیکچروں سے بھی آپ کا مقصد نظام تعلیم کو از سر نو اسلامی روایات اور اصولوں پر ڈھالنا تھا۔ یہی خطبات آپ نے ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں سر سید راس مسعود، وائس چانسلر کی دعوت پر دئے۔ میں اسوقت بھی آپ کے ہمراہ تھا۔

۱۹۳۲ء میں جب آپ لندن میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر تشریف لے گئے تو وہاں کے مشہور علمی ادارے ارسٹوٹلین کی دعوت پر آپ نے ایک لیکچر بعنوان "کیا مذہب ممکن ہے" دیا۔ لندن میں اس لیکچر کی طباعت کا انتظام بھی میں نے ہی کیا تھا۔ غرضیکہ یہ تمام خطبات جو تعداد میں سات ہیں۔ انگریزی میں طبع ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کتاب اور مقدمے سے متذکرہ بالا پس منظر ذرا کم واضح ہوتا ہے۔

متذکرہ بالا لیکچروں کے سلسلے میں جب ۱۹۳۰ء میں علامہ صاحب علی گڑھ ہی میں تھے تو مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج کے پرنسپل خواجہ غلام السیدین نے ان سے با لاستیعاب ملاقاتیں کیں اور آپ کے نظریۂ تعلیم کے تجزئے کے طور پر آپ سے مذاکرات کر کے استفادہ کیا۔ اس کے بعد جب وہ لاہور کے راستے سے کشمیر جا رہے تھے۔ تو اس وقت بھی لاہور میں اسی مسئلے پر اکثر مذاکرات ہوئے۔

سیدین پیہم آپ سے استفسار کرتے رہے۔ چنانچہ آپ کے ایک خط کے جواب میں علامہ خود سیدین صاحب کو ۱۹ جون ۱۹۳۶ء کو لکھتے ہیں کہ میں نے ضربِ کلیم میں ایک حصّہ "تعلیم و تربیّت" پر وقف کیا ہے۔ ممکن ہے آپ کو اس میں کوئی نئی بات نظر نہ آئے۔ تاہم اگر کتاب آپ کو بر وقت مل جائے تو محولا بالا حصّہ ضرور مطالعہ فرمایئے۔

آخر اس جستجو کے بعد خواجہ غلام السیّدین نے ایک کتاب بعنوان "اقبال کا فلسفۂ تعلیم" "EDUCATIONAL PHILOSOPHY OF IQBAL" لکھی۔ جو ۱۹۳۸ء میں چھپی۔ ان ملاقاتوں میں اکثر بس بھی موجود رہا۔ غرضیکہ یہ کتاب اقبال کے فلسفۂ تعلیم پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک اسلامی روایات پر انسانیّت کا ڈھالنا ضروری ہے۔ اس ضمن میں آپ نے اکثر اشعار بھی پیش کئے ہیں مجھے علم ہے کہ ایک روز خواجہ غلام السیدین نے علامہ صاحب سے جب وہ نہایت استغراق کی حالت میں تھے۔ ایک مرحلے پر وضاحت طلب کی تو علامہ نے فوراً نہایت واضح اور آسان الفاظ میں فرمایا کہ "انسان تعلیم کے ذریعے غلامی سے آزاد ہو کر اور اپنی خودی قائم رکھ کر شخصیّت و کردار پیدا کرے اور یہ محض ذاتی جہاد ہی سے ہو سکتا ہے" اس ضمن میں اُنھوں نے سلطان ٹیپو کا کردار بطورِ نمونہ پیش کرتے ہُوئے فرمایا۔

اے من و تو موجے از رودِ حیات ہر نفس دیگر شود این کائنات
بندگانی انقلاب ہر دمے است زانکہ او اندر سراغ عالمے است

یعنی اقبال کے نزدیک معاشرہ ایک متحرک قوت ہونا چاہیئے۔ انقلاب اور تدبیر سے جو نتائج پیدا ہوں معاشرے میں انکا انعکاس ہو۔ حیات ایک مبہم حالت معمہ ہے۔ کیونکہ انسان کے تخیل میں انقلاب اور حرکت ہمیشہ موجزن رہتے ہیں۔ آپ کے نزدیک سلطان ٹیپو ان امور کا مظہر ہے۔ جیسا کہ آپ کے اشعار سے جب یہ واضح ہے۔ "میں اور تو" محض دریائے حیات کی موجیں ہیں۔ دُنیا ہر دم ایک بحران اور انقلاب سے دوچار ہے۔ زندگی ہر دم تغیّر پذیر ہے۔ اور اس کے لئے ہر دم ایک نئی راہ کی ضرورت ہے۔ اور آدمی کو یہ مبہم حرکت سرشار رکھتی ہے، خواہ کارواں ناقہ صحرا دشت واقع ہوں۔ یہ صورت محض صحیح اسلامی تعلیم کے جذبے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ علامہ اقبال کے لیکچروں کا تقاضا ہے کہ ہمارا طریقہ تعلیم اس آزاد ملک کی آزاد آب ہوا میں اسلامی اقدار پر آراستہ ہو۔

جب ہم مدراس میں تھے تو وہاں کی مستورات نے آپ کیلئے الگ ایک خاص نشست کا اہتمام کیا۔ راقم بھی آپ کے ہمراہ تھا۔ یہ محفل پنجاب کے مسٹر عبد السلام جنرل پوسٹ ماسٹر کے مکان پر منعقد ہوئی۔ تمام عورتیں پردہ میں تھیں۔ اور ہم لوگ باہر تھے۔ وہاں بھی آپ نے اسی طرح عورتوں کو خطاب کرتے ہوئے اسلامی تعلیم کے تحت غض البصر کا ذکر کیا جس سے مراد یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں ہر دو کو نظریں نیچی رکھنی چاہئیں تاکہ معاشرے میں کوئی خلل نہ آئے آپ نے وہاں عورتوں کے اصرار پر اپنی مشہور نظم "فاطمہ بنت عبداللہ" تحت اللفظ پڑھ کر سُنائی اور اس نظم کی تشریح بھی اپنے اسلامی تعلیم کے نقطہ نظر کے تحت کرتے ہوئے فرمایا کہ عورتوں کو بنی نوع انسان کیلئے جذبۂ خدمت پیدا کرنا چاہیئے۔ اقبال نے ادب

برائے ادب کی بھی مخالفت کی۔ اسرار خودی کے تحت وہ انسان کو معنوی اور صوری فضیلت کا احساس دلاتے ہیں۔ اقبال کمالات فطری کی قدر کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

لاہور میں ایک مرتبہ عید میلاد کے موقع پر مغرب کی نماز کے بعد اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں آپ کی صدارت میں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ تقریر کرنیوالوں میں سے مجھے دو کے نام یاد ہیں۔ اوّل تو حضرت مولانا محمدؒ ابراہیم میر سیالکوٹی متوفی ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء اور دوسرے مسٹر شمس الدّین خاور۔ سامعین ہمہ تن آپ کے ارشادات سُننے کے متمنی تھے۔ چنانچہ مقررین کی تقریر کے بعد آپ نے خاص طور پر اسلام میں عورت کی تعلیم کے متعلق کہنا شروع کیا اور اس ضمن میں آپ نے قرآن کریم کی آیت "الرجال قوامون علی النسآء" بھی تلاوت فرمائی۔ بعد میں انکی تشریح اور معنی بتانے شروع کئے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی نے اس آیت کی تشریح میں یہ اضافہ کیا۔ کہ عربی زبان میں لفظ "قائم" پر جب حرف جار "علیٰ" آتا ہے تو معنی حفاظت کے ہو جاتے ہیں۔ یعنی مردوں کو عورتوں کی خبر داری کرنی چاہیئے۔ اس پر علاّمہ نے فوراً مولینا کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ اسلام میں عورتوں کی دیکھ بھال اور ان کی صحیح تعلیم کا ذمہ دار مردوں کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اور یہ بھی واضح کیا کہ اس صورت میں عورت مرد کے مساوی حقوق کی حق دار نہیں ہے۔ وہ مرد کی تابع ہے اور اس کی تعلیم بھی اسی نہج پر ہونی چاہیئے۔ معاشرے میں ہر دو کو الگ الگ خدمات تفویض کی گئی ہیں اس لئے ان کے فرائض بھی جدا جدا ہیں۔ جن کو انھیں ایک مقصد کے مختلف پہلوؤں کو مدّنظر رکھ کر الگ الگ حیثیتوں سے عمدگی سے انجام دینا چاہیئے

تاکہ ایک ہی اسلامی خاندان کے افراد کی اسلامی حدود میں رہ کر انفرادی کوششوں سے ایک خاندان اسلامی یعنی خانوادہ فلاح اور صحت کے ساتھ نشو و نما پائے اور اس طرح ایک اسلامی معاشرہ پیدا ہو جائے جو دورِ حاضر میں اشد ضروری ہے۔ خاص کر مسلمان عورت کو اسلامی معاشرے میں بدستور اسی حد کے اندر رہ کر اسی مقصد کیلئے کردار ادا کرنا چاہیئے۔ یعنی مسلمان سوسائٹی میں عورت بذاتِ خود ماں کی حیثیت سے ملت اسلامیہ کا ایک بہت اہم اور ذمہ دار فرد ہے، اور اس پر ایک اسلامی گھر اور اسلامی معاشرے کے مستقبل کا دار و مدار ہے۔ چنانچہ اقبال فرماتے ہیں۔

اے روایت پردہ ناموس ما
تا تو سرمایۂ فانوس ما

ایک دفعہ کا ذکر ہے ابھی جاوید اقبال کی عمر مشکل سے دو سال تھی اور علامہ اقبال اسے فرطِ محبت سے "بّبا" کہا کرتے تھے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ اور وہ گھر کی روزمرہ کی زندگی میں پل رہا تھا۔ علامہ نے فرمایا کہ اب اس بچے کو کیا ضرورت ہے کہ ہم اسے روزہ رکھنے کے آداب یا اوقات افطار و سحر کا سبق دیں جب کہ یہ خود بخود گھر کے ماحول میں ان کا عادی ہو رہا ہے مگر سوال تو ان گھروں کا ہے۔ جہاں نہ روزے کا تصور ہے اور نہ اس کے احترام کا تردّد کیا جاتا ہے۔ اس گھر کے افراد کو کیسے اس حقیقت کا علم اور اہمیّت کا احساس ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے معاشرے کے ہر گھر کو اسلامی زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہیئے تاکہ اس گھر کا بچہّ خود بخود اسلامی شعار کی تربیت و واقفیت حاصل کرتا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری اسلامی تعلیم ہمارے اندرونِ گھر سے شروع ہو جاتی ہے۔

علامہ اقبال نے ایک مرتبہ ۱۹۲۰ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کے موقع پر ایک نظم بعنوان "چند پکوڑے" پڑھی تھی جو دراصل اکبر الہ آبادی کی طرز پر تھی اسی میں بہت سے روزمرہ کے امور کی طرف ملیحانہ اشارات تھے ذیل کے اشعار خاص طور پر قابلِ ملاحظہ ہیں۔ فرماتے ہیں۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِّنظر
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اس کے دوسرے روز ہی اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ کوئین میری کالج کی لڑکیاں گھروں سے بھاگ گئی ہیں۔ جن میں اکثر لڑکیاں مسلمان گھروں کی تھیں، لوگوں نے فوراً کہا کہ اقبال نے اس کی پیشین گوئی پہلے ہی کر دی تھی ایک نظم کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

غرضیکہ موجودہ طریقۂ تعلیم سے اقبال مطمئن نہیں تھے اور اس کے خلاف یہ ایک طرح سے کھلم کھلا احتجاج ہے۔

اس مختصر وقت میں علامہ اقبال کے نظریۂ تعلیم پر چند مشاہدات پیش کرنے کے بعد

اب ذرا آداب محفل کے عام فہم ماحول کے مطابق ایک واقعہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ علامہ اقبال کے معاصرین میں ایک شخص پروفیسر مدن گوپال سنگھ چاولہ، پروفیسر ریاضی گورنمنٹ کالج لاہور تھے۔ وہ جب کبھی کالج سٹاف روم میں موجود ہوتے تو اکثر حاضرین کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھتے۔ ان میں عام انسانی اصولوں کی کمی دیکھ کر ایک روز علامہ اقبال نے اسے ایک طرح صحیح سلیقہ بتانے کی غرض سے بطورِ ظرافت فرمایا "پروفیسر چاولہ، میں آپ کو عام سلیقہ (COMMON SENSE) سکھاتا ہوں، اور آپ مجھے اس کے بدلے ریاضی پڑھا دیں" اس پر سٹاف روم میں خوب قہقہہ ہوا۔ اور اس کو سمجھایا گیا مگر پروفیسر چاولہ پھر بھی نہیں سمجھا یعنی اس شخص کو خانگی زندگی میں یہ ادب آداب بتائے ہی نہیں گئے تھے اور اب اس کو ان امور کا احساس بھی نہیں تھا کہ ہمارے ہاں محفل میں اس قسم کا بھی کوئی سلیقہ ہوتا ہے۔

حضرات میں نے مختصر طور پر اقبال کا نظریۂ تعلیم، فرد اور جماعت ہر دو کو مدِنظر رکھ کر پیش کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ ایک بہت ہی وسیع اور عظیم الشان موضوع ہے۔

وما توفیقی الا باللہ

(محمد عبداللہ چغتائی)

اقبالؔ کے کلام میں رُباعی کی اہمیت

سید عابد علی عابدؔ

اقبالؒ کے کلام میں رُباعی کی اہمیت

اس سلسلے میں دو باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ علامہؒ رُباعی کے متعارفہ اوزان میں جن میں کثرت سے زحاف پیدا ہوتے ہیں، رُباعی نہیں کہتے بلکہ انھوں نے اپنے لئے اس صنف کے ایک خاص وزن کو مخصوص کرلیا ہے جو ہزج سالم کی ایک صورت ہے۔ اس بحر میں عربوں نے اپنے لطیف ترین گانوں کی دُھنیں باندھی ہیں۔ اور بابا طاہر عریان نے جو اوائل عہد سلاجقۂ کبیر کا رُباعی گو ہے۔ اس وزن کو گویا اپنے لئے مخصوص کرلیا ہے۔ اس وزن کی شیرینی اور عدم پیچیدگی کی وجہ سے غالباً علامہ نے بھی تمام رباعیات اسی وزن میں کہیں۔ بعد میں جب بعض ماہرین عروض کے درمیان اس بات پر اختلاف ہوا کہ آیا یہ وزن دراصل رباعی کیلئے استعمال ہوسکتا ہے تو بہت بال کی کھال نکالی گئی لیکن ادبیات فارسی کے مورخوں اور نقادوں کی اکثریت اس وزن کو رُباعی ہی کا وزن شمار کرتی رہی

تفصیلات کیلئے دیکھئے فلسفۂ اقبال میں بابا طاہر عریاں پر راقم السطور کا مضمون (کہ سیّد سجاد رضوی نے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے[1]۔ خیام تصنیف سیّد سلیمان ندوی مرحوم[2]۔ تحقیق کی روشنی میں: تالیف پروفیسر عندلیب شادانی[3] وغیرہم)۔ دوسری بات جو دیاً قاری کے پیش نظر رہنی چاہیئے یہ ہے کہ علاّمہ مرحوم نے پہلے رباعی میں اپنے منتشر خیالات کا اظہار کیا جو طویل نظم میں نہ کھپ سکتے تھے۔ اگرچہ اس کا استثنا بھی موجود ہے۔ مثلاً پیام مشرق کی رُباعیات لالہ طور، جن میں ایک وحدت ترکیبی پائی جاتی ہے لیکن بہ مرور زمانہ علاّمہ کی طبیعت میں اضمحلال کا رنگ ایسا گہرا ہوگیا کہ وہ طویل منظومات کی تشکیل میں مصروف رہنے سے ابا کرنے لگے۔ چنانچہ بتدریج ہم دیکھتے ہیں کہ نظمیں مختصر، سادہ، معنا عمیق لیکن لفظاً سلیس، ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ضرب کلیم جو علاّمہ کی معرکے کی اُردو تالیف ہے اور "دورِ حاضر کے خلاف اعلان جنگ" کی بے باکانہ حیثیت رکھتی ہے، حقائق اور کوائف سے بلا واسطہ بحث کرتی ہے اور شعری محاسن پیدا کرنے کی ہر قسم کی شعوری کوشش سے آزاد نظر آتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ علاّمہ کی مشق سخن، ان کا الفاظ و تراکیب پر عبور اور اسالیب کلام سے ان کی آشنائی ان کے لکھے ہُوئے اشعار کو جذّاب اور دلکش بنا دے۔ تو میں یہ کہنے جا رہا تھا کہ علامہ نے بہ تدریج خصوصاً اواخر عمر میں رُباعی کو اپنے دقیق ترین خیالات کے اظہار

---

[1] بزم اقبال سنہ ۱۹۵۷ء

[2] دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

[3] غلام علی اینڈ سنز لاہور طبع اوّل سنہ ۱۹۶۳ء

کا ذریعہ بنایا اور ارمغانِ حجاز جو ان کی آخری تصنیف ہے اس میں پہلے حصّے کی رُباعیات کو یوں ترتیب دیا کہ ان میں ایک صناعانہ وحدتی ترکیب بھی قائم رہی اور علاّمہ جو کہنا چاہتے تھے ان خیالات کی تفہیم کیلئے راہ بھی ہموار ہوگئی انھوں نے اپنے معانی و مطالب کی شقوں میں یوں تقسیم کر دیا ہے کہ وہ مل کر، ملّت کی تربیت اور تعمیر کیلئے ان کے مشوروں پر مشتمل بھی ہو گئے اور خیالات کی ترتیب و تدوین نے ان کی اہمیت اور ان کی نوعیت کے متعلق بھی معلومات مہیا کیں۔

صرف ارمغان حجاز کی رُباعیات کی ترتیب و تدوین یوں معنی بند ہے رُباعیات کے عنوانات :

(۱) حضورِ حق (۲) حضور رسالتؐ (۳) حضور ملّت۔ اس عنوان کے تحت ذیلی عنوان یُوں درج ہیں :

(الف) خودی (ب) انا الحق (ج) صوفی و ملا۔ (د) رومی (ہ) پیام فاروق (و) شعرائے عرب (ز) اے فرزندِ صحرا (ح) خلافت و ملوکیت (ط) ترکانِ عثمانی (ی) دخترانِ ملّت۔ (ک) عصر حاضر (ل) برہمن (م) تعلیم (ن) تلاش رزق (س) نہنگ بابچہ خویش (ع) خاتمہ (۴) حضور عالم انسانی : اس میں یہ ذیلی عنوان ہیں (الف) تمہید (ب) دل۔ (ج) خودی (د) جبر و اختیار (ہ) موت (و) ابلیس خاکی و ابلیس ناری۔ (۵) یارانِ طریق۔

یہ پانچ عنوان ہیں اور ۲۰ ذیلی عنوان۔ ذرا غور فرمائیے گا تو روشن ہو جائے گا کہ علاّمہ نے جو کچھ ایک طویل مدّت میں کہا سُنا ہے۔ اب وہ چاہتے

ہیں کہ اس کی تلخیص اور صف بندی اس طرح ہو جائے کہ علاّمہ کے معانی میں شک رہے نہ ان کے مطالب میں کوئی ناروا پیچیدگی۔ علاّمہ نے ہمیشہ کہا ہے کہ نمازِ بے حضور سے وہ کیف نصیب نہیں ہوتا جو مدعائے شارع ان رباعیات کے پہلے حصّے میں جہاں تک میں ان کے مطالب کا تجزیہ کر سکا ہوں علاّمہ حضورِ حق یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نماز اور شعائرِ اسلامی کی پابندی بیحد ضروری ہے۔ لیکن انجلائے قلب تزکیہ نفس اور دل کو تجلیاتِ الٰہی سے منور کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ گویا علامہ شریعت اور طریقت کے اتصالِ کامل پر زور دے رہے ہیں کہ اوامر و نواہی کی پیروی کرو لیکن اس سپردگی، ایسی دلباختگی اور فریفتگی کے ساتھ کہ تم پر احکامِ شرع کے رموز روشن ہو جائیں۔

دِلے در سینہ دارم بے سرورے | نہ سوزے در کفِ خاکم نہ نُورے
بگیر از من کہ بر من بارِ دوش است
ثوابِ ایں نمازِ بے حضورے

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر | شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہؐ مارا | حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

حضورِ رسالتؐ کے تحت جو رباعیات درج ہیں ان سے اس فریفتگی کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے، جو علاّمہ کو رسولِ پاکؐ سے تھی کہ انہیں کی ذاتِ گرامی نے اپنے عمل سے اسے علمِ محکم بنا دیا تھا۔ اور اخلاق کے اعتبار سے اس مقام پر پہنچ گئے

تھے کہ ان کے متعلق یہ مصرع جو بہت مشہور ہے ان کی جلالتِ قدر اور منزلت کی شہادت دیتا ہے۔ با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار۔

اقبال کہتے ہیں:

مقامِ عشق و مستی منزلِ اوست
چہ آتش ہا کہ در آب و گلِ اوست

نوائے او بہ ہر دل سازگار است
کہ در ہر سینہ قاشے از دلِ اوست

پھر فرماتے ہیں۔

حضورِ ملتِ بیضا تپیدم
نوائے دل گدازے آفریدم

ادب گوید سخن را مختصر گوے
تپیدم، آفریدم، آرمیدم

حضورِ ملت کے ذیلی عنوانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملت کی کن منازل کو فتح شدہ اور کن مسائل کو محلِ اسرار سمجھتے تھے۔ انھوں نے فرداً فرداً ان عناصر کی نشاندہی کی ہے جن کی طرف حکمائے امت کی توجہ ضروری ہے۔ مثلاً خودی۔ شعرائے عرب۔ انا الحق رومی۔ خلافت و ملوکیت۔ پیام فاروق، صوفی و ملا، دختران ملت۔ عصر حاضر، برہمن و تعلیم۔ اغیار نے ہمیں جو تعلیم دی اور برہمن نے جس طرح اسے رنگ کر ہمارے کتب خانے کے طاقوں کو سجایا وہ ایک اہم سوال ہے۔ جو اس وقت ملت کی توجہ کا منتظر ہے۔ اور تاریخ کے تقاضے مسلسل کہہ رہے ہیں۔ کہ ایک نئی تاریخ کی تسوید و تدوین ضروری ہے۔ جو حق کو باطل سے جدا کر دے، دخترانِ ملت، اور عصر حاضر کے متعلق ذرا سُن لیجئے کیا فرماتے ہیں۔

دخترانِ ملت کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

بهل اے دخترک ایں دلبری را　　مسلماں را نہ زیبد کافری ہا
منہ دل بر جمالِ غازہ پرورد　　بیاموز از نگہ غارتگری ہا

اگر پندے ز درویشے پذیری　　ہزار اُمّت بمیرد تو نہ میری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر　　کہ در آغوشِ شبیرے بگیری

برہمن اور عصرِ حاضر کس طرح مل کر مسلمان کو ترکستان کی طرف لئے جا رہے ہیں اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

درِ صد فتنہ را بر خود کشادی　　دو گامے رفتی و از پا فتادی
برہمن از بتاں طاقِ خود آراست　　تو قرآں را سرِ طاقے نہادی

جواناں را بد آموز است ایں عصر　　شبِ ابلیس را روز است ایں عصر
بدامانش مثالِ شعلہ پیچم　　کہ بے نور است و بے سوز است ایں عصر

علم کے صحیح منصب۔ درس و تدریس کے درست مقام، اور متعلقہ تربیت اور ذہنی پرورش کے متعلق علّامہ کس بصیرت سے کام لے کر کہتے ہیں:

تب و تابے کہ باشد جاودانہ　　سمندِ زندگی را تازیانہ
بفرزنداں بیاموز ایں تب و تاب　　کتاب و مکتب، افسون و فسانہ

یہ تو اکبر کہہ ہی گیا ہے کہ:

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
علم ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

علاّمہ نے اس پر کچھ اضافہ کیا کچھ تشریح کی :

نہ علمِ چارہ سازے ، بے گدازے

بسے خوش تر نگاہِ پاک بازے

نکو تر از نگاہِ پاک بازے

دلے از ہر دو عالم بے نیازے

کبھی مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیّت واقعی ایسا ہی تھا کہ علم کے طالب کو بالکل مستغنی کر دیا جاتا تھا کہ معاش کیطرف سے بے پروا ہو کر تحصیلِ علوم کرے اور علم فروشی کا بازار گرم کر کے نہ بیٹھ جائے۔

اس حصہ کا خاتمہ اس بات سے ہوتا ہے کہ میں نے بے باکانہ جو کچھ شیوخِ ملّت اور اساتذہ کبریٰ سے سُنا وہ تم تک پہنچا دیا۔

حدیثِ عشق بے باکانہ گفتم ۔۔۔ نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم

زرا باشوخیٔ رندانہ گفتم ۔۔۔ شنیدم آنچہ از پاکانِ اُمّت

حضور عالمِ انسانی کے ذیل میں بھی علاّمہ نے بہت سی چیزیں جمع کی ہیں۔ مثلاً دل ۔ خودی ۔ جبر و اختیار ، موت ۔ ابلیسِ خاکی و ابلیسِ نوری در اصل ذیلی عنوانوں میں عالمِ انسانی کی تمام اہم متنازعہ فیہ اقدار آ گئی ہیں۔ اور علاّمہ نے حضور عالمِ انسانی میں کس طرح رسائی حاصل کی ہے۔ اس کے متعلق جاوید نامہ کا جو شعر نقل کیا گیا ہے۔ وہ شنیدنی ہے :

باخبر شو از مقامِ آدمی ؛ آدمیت احترامِ آدمی

مشینوں، سائنسی انکشافات، نفسیاتی مکشوفات و ملفوظات اور خودکشی پر تُلی ہُوئی دُنیا میں علاّمہ اِنسان کو اور مسلمان کو داخل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس شان سے کہ وہ اس دُنیا کے تمام حقیقی امکانات کا جائزہ لینے کے بعد تسخیرِ مہرو ماہ کا فریضہ ادا کرے اور عالمِ انسانی کی رہنمائی کر کے اسے اس مقام تک پہنچا دے۔ جہاں آدمیّت احترام آدمی کا دعویٰ درست و چسپت ہو جاتا ہے۔ اور یوں آدمی، آدمی ہی سے برسرِپیکار رہے اور مصنوعی حدیں اور متضاد اقدار بنا کر، خوامخواہ اس دُنیا کو جنگ کی بھٹیوں میں جھونکنا چاہے نو اور بات ہے۔ اس عنوان کے ماتحت پہلے تو یہ مشورہ دیا گیا ہے:

خویش پیچیدن بیاموز — بناخن سینہ کاویدن بیاموز
اگر خواہی خدا را فاش بینی — خودی را فاش تر دیدن بیاموز

انسان اور خدا کے تعلق باہمی کی نزاکت کیطرف اشارہ کرنے کے بعد علاّمہ انسان کو، اپنا بوجھ آپ ڈھونے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اپنی صلاحیتوں پر خود اعتمادی کا درس دیتے ہیں۔ وہم و گمان کے مقابلے میں تیقن و انسحکام ذہنی کا تفوق جتاتے ہیں پھر غلط قسم کے صوفیوں اور گمراہ کُن ملاّؤں سے بچنے کا درس دیتے ہیں۔ اور پھر یہ رمز اس پر ظاہر کرتے ہیں کہ حقیقت وہی ہے جو تجھ پر بیت جائے۔ روایت غلط، خبر غلط۔ نظر اور بصیرت صحیح۔ اس معاملہ پر بڑی دقیق بات کہی ہے:

وجود دست ایں کہ بینی یا نبود است — حکیم ما چہ مشکل ہا کشود است
کتابے ہر فنِ غواص بنوشت
ولیکن در دلِ دریا نبود است

اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اہلِ کار کو دیانت داری سے اپنا فریضہ ادا کرنے کا مشورہ دیا جائے اور منطقی الجھنوں میں گرفتار ہونے سے پرہیز کیا جائے کہ اصل مسئلہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

فرماتے ہیں:۔

بہ ضربِ تیشہ شکن بے ستوں را | کہ فرصت اندک و گردوں دو رنگ است
حکیماں را دریں اندیشہ بگذار | شرر از تیشہ خیزد یا ز سنگ است

علامہ کئی بار کہہ چکے ہیں کہ دل زندہ ہو اور خودی کا نقطۂ مُتیز روشن ہو انسان مرتا نہیں، موت کا فرشتہ بدن کو تو چھو لیتا ہے لیکن اس کے مرکز سے دور رہتا ہے اس مرحلے پر یہی بات نہایت دل افروز اور خوبصورت اسلوب میں کہی:

نہ پنداری کہ مردِ امتحاں مُرد | نہ میرد گرچہ زیرِ آسماں مُرد
ترا شایان چنیں مرگ است ورنہ | زہر مرگے کہ خواہی مے تواں مُرد

لیکن یہ معیار زندگی بہت بلند اخلاقی اقدار کی پابندی سے ہاتھ آتا ہے۔

بروں کن کینہ را از سینۂ خویش | کہ مُرد دِ خانہ از روزن بروں بہ
کشتِ دل مدہ کس را خراجے | مشوا ے دہ خدا غارت گِردہ

کیسی اچھوتی تشبیہ ہے اور کیسی نادر علامتوں سے سمجھایا گیا ہے کہ:۔

کفرست در طریقت ما کینہ داشتن؛

آئینِ ماست سینہ چوں آئینہ داشتن؛

دل کے متعلق کیا صوفیہ نے اور کیا فلاسفہ نے بڑی مُوشگافیاں کی ہیں۔

دل کیا ہے۔ کہاں ہے۔ دماغ سے اس کا تعلق کیا ہے۔ کیا دماغ سے علیحدہ اس کا تصوّر کرنا بھی ممکن ہے۔ کیا زبان کے محاورے۔ دل نہ مانا، دل رُک رُک جاتا تھا، دل کو تسلّی نہ ہوئی۔ دل کو اطمینان ہُوا۔ کیا یہاں ہر جگہ مراد دماغ ہے اور کیا دماغ کے جو عمل پیرا محرکات ہیں وہی، دل کے بھی ہیں اور اسی طرح عمل کرتے ہیں۔ اب تو اہلِ طب اور اہلِ فلسفہ دونوں کہنے لگے کہ دماغ سے ماورا ایک چیز ہے تو سہی جو الفاظ کی گرفت میں نہیں آتی لیکن جس کا شعور ضرور ہوتا ہے۔ خود علامہ نے فرمایا تھا:

مقام اس کا ہے دل کی خلوتوں میں
خدا جانے مقامِ دل کہاں ہے

ارمغاں میں فرماتے ہیں:۔

من و تو کشتِ یزداں۔ حاصل است ایں
عروسِ زندگی را محمل است ایں
غبارِ راہ شد دانائے اسرار
نہ پنداری کہ عقل است ایں، دل است ایں

دل کی ہزار شیوہ طرازیوں کے متعلق فرماتے ہیں:

گہے جوئندہ حسنِ غریبے — خطیبے منبرِ او از صلیبے
گہے سلطانِ با خیل و سپاہے — وے از دولتِ خود بے نصیبے

پھر فرماتے ہیں:

محبت چیست؟ تاثیرِ نگاہے ست — چہ شیریں زخمے از تیرِ نگاہے ست

بہ صید دل روی با ترکش بیندا ز
کہ این نخچیر نخچیر نگاہے است

خودی کے متعلق علامہ نے بڑی دقیقہ سنجی سے کام لیا ہے اور اسے حیات انسانی کا وہ نقطۂ ستیز بنا دیا ہے جہاں سے تمام عمل اور زندگی کے چشمے پھوٹتے ہیں، لیکن اس کی قوت کا یہ طوفان شنیدنی ہے:

چو قومے در گذشت از گفتگو ہا ‏ ‏ ‏ ز خاک او بروید آرزو ہا
خودی از آرزو شمشیر گردد ‏ ‏ ‏ دم او زنگ ہا برّوز بوہا

یہ نازک خیالی ملاحظہ فرمائیے کہ خودی قوت اعتماد آرزو سے ایسی ہو جاتی ہے کہ تلوار براں بن کر زنگ کو بو سے علیحدہ کر سکتی ہے یعنی ناممکن کو ممکن بنا کے دکھا سکتی ہے۔

اسی سلسلے میں جبر و اختیار پر علامہ کی نہایت فکر انگیز رباعی ہے جس میں تقدیر و تدبیر کے بعض پہلوؤں کی طرف نہایت نفیس اشارے کئے گئے ہیں۔
مرحوم اثر صہبائی کی ایک رباعی ہے، اور علامہ ہی کے فیضان کا کرشمہ ہے۔

خاموش رہوں اثر کہ تقریر کروں ! ممکن نہیں سر تابیٔ تقدیر کروں
تدبیر بھی کرنے پہ ہوں مجبور مگر ! تقدیر میں لکھا ہے کہ تدبیر کروں

علامہ نے اطالیہ در روما کی تاریخ کا پس منظر سامنے رکھ کر فرمایا ہے۔

بہ روما گفت با من راہب پیر ‏ ‏ ‏ کہ دارم نکتہ از من فرا گیر
کند ہر قوم پیدا مرگ خود را
ترا تقدیر و ما را گشت تدبیر

علامہ عصرِ حاضر کی اقدار کی مخالفت اس حد تک کرتے ہیں کہ جب ابلیس خاکی و نوری کا سوال پیدا ہوتا ہے تو وہ پہلے یہ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں بھی ابلیس موجود ہیں، لیکن ان کا رنگ روپ ان کا طریق کار اور ان کا اسلوبِ فریب وہی جداگانہ ہے، اقبال کے خیال میں انسان ایسا ضعیف و ناتواں ہو چکا ہے کہ اب ابلیس کو فریب کاری کرتے ہوئے شرم آنی چاہیئے۔ علامہ ابلیس اور اس کے ساتھیوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ آج کل کے لوگ، ایسے مذہب فروش، یزداں فروش، دشمنِ ایمان اور الٰہی اقدار کے قائل ہیں کہ ان کا شکار کھیلنا ابلیس کے لئے باعثِ ننگ ہے، نتیجہ علامہ یہ نکالتے ہیں کہ اس زمانے کے شیطان بھی، اس زمانے کے لوگوں کی طرح ضعیف و ناتواں اور بے غیرت ہیں۔ اس لئے غیرت مند انسانوں کو جو "اصیل" ہیں دراصل وہی ابلیس زیادہ پسند آئیں گے جو انسان اور ابلیس کی پہلی چپقلش اور یزداں و اہرمن کے فسادات سے آگاہ ہیں۔

فرماتے ہیں:۔

چہ شیطانے اخرامش واژگونے
کند چشمِ ترا کور از فسونے
من او را مردہ شیطانے شمارم
کہ گیرد چوں تو نخچیرِ زبونے

اسلئے عالی نسب انسانوں کیلئے وہی پرانے ابلیس درکار ہیں۔

مشو نخچیرِ ابلیساں ایں عصر
خساں را غمزۂ نشاں سان گار است

اصیلاں را ہماں ابلیس خوشتر
کہ یزداں دیدہ و کامل عیارست

مندرجہ بالا گذارشات سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ علامہ نے اواخر عمر میں رباعیوں سے کیسا اہم اور عظیم کام لیا ہے۔ اور اپنے بنیادی خیالات کو کس طرح رباعیات کی ایک خاص ترتیب میں سمو دیا ہے۔ اس پر اور کام ہو سکتا ہے لیکن وہ کسی اور صحبت میں سہی۔

(سید عابد علی عابد)

پیامِ مشرق پر ایک نظر

ڈاکٹر سید محمد اکرم

پیامِ مشرق پر ایک نظر

"پیامِ مشرق" علامہ اقبال نے جرمنی کے شہرہ آفاق شاعر گوئٹے کے جواب میں لکھی۔ کتاب کا دیباچہ جرمن ادب میں مشرقی تحریک کے متعلق ایک عمدہ بحث پر مشتمل ہے ابتدائی حصے میں ۱۶۳ رباعیاں "لالۂ طور" کے عنوان سے ملتی ہیں جن کا انگریزی ترجمہ پروفیسر آربری نے Tulip of Sinai کے نام سے کیا ہے، یہ رباعیاں جنھیں بہتر ہوگا کہ دوبیتیوں کا نام دیا جائے۔ سبکِ شعر کے اعتبار سے بابا طاہر عریاں کی پیروی میں کہی گئی ہیں، زبان و بیان کی خوبیوں اور مطالب و معانی کی ندرتوں کے لحاظ سے یہ دوبیتیاں کلامِ اقبال کا بے نظیر حصہ ہیں، علامہ کی زبان نے عظیم افکار کے متحمل ہونے میں جس قوت کا ساتھ ان مختصر ترانوں میں دیا ہے وہ کہیں اور شاید کم نظر آئے۔ البتہ اقبال بابا طاہر سے اس لحاظ سے بالکل مختلف ہیں کہ علامہ کے موضوعات طاہر کی طرح عاشقانہ نہیں بلکہ زیادہ تر فلسفیانہ اور عارفانہ ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ "افکار" کے نام سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں اکثر،

انواعِ سخن مثلاً قطعہ، مثنوی، مسمط، ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد اور قصیدہ وغیرہ پر طبع آزمائی کی گئی ہے، یہ مختلف آہنگوں پر مشتمل چھوٹی بڑی منظومات اقبال کی فکر و فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اس حصے کی اکثر نظموں میں انسان کی بنیادی صلاحیتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور فلسفہ حرکت کو بالخصوص موضوع بحث بنا کر زندگی کے ارتقائی مراحل کی توضیح کی گئی ہے۔ اقبال نے انسانی حرکت اور ارتقا کو مغربی فلسفیوں کے برعکس عشق اور اس کے سوز و گداز کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ عشق کے عنوان سے ایک نظم میں فرماتے ہیں ؎

جز عشق حکایتے ندارم　　پروائے ملامتے ندارم
از جلوۂ علم بے نیازم　　سوزم گریم تپم گدازم

"حکمت و شعر" کے عنوان سے ایک قطعہ نہایت پُر معنی اور قابلِ توجہ ہے جس میں مشرق کے عظیم فلسفی بو علی کو عقل و حکمت سے تعبیر کیا ہے اور رومی کو عشق و وجدان سے ؎

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم　　دست رومی پردہ محمل گرفت
این فروتر رفت و تا گوہر رسید　　آں بگرداب ے چو خس منزل گرفت
حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر میگردد چو سوز از دل گرفت[۲]

تیسرے حصے میں "مئے باقی" کے عنوان سے ۴۵ غزلیں ہیں۔ "مئے باقی"

۱۔ "پیام مشرق" طبع دہم، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۱۴۳ ۲۔ ایضاً، ص ۱۲۲

کا عنوان حافظ کے اس شعر سے اقتباس ہے۔

بدہ ساقی مئی باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلی را[۳]

اِن میں بہت سی غزلیں حافظ کی پیروی میں کہی گئی ہیں، اقبال کیلئے شیرازی نوا تو پسندیدہ ہے ہی لیکن یہ التزام خصوصاً اسی لئے بھی کیا ہے کہ چونکہ گوئٹے حافظ کے کلام سے غیر معمولی طور پر متاثر تھا اور اپنے آپ کو اس کا مرید تصوّر کرتا تھا۔ اور حافظ کے کلام کو ابدیت کی طرح عظیم اور ازلی و ابدی گردانتا تھا۔ لہٰذا اقبال نے اس رعایت سے غزلوں کا ایک بہت بڑا حصّہ ایسا تصنیف کیا ہے جو زبان و بیان کے اعتبار سے بہت حد تک غزلیاتِ حافظ کا رنگ لئے ہُوئے ہے۔ بعض غزلیں رومی کی تقلید میں بھی ہیں اور بعض میں نظیری کا استقبال بھی کیا گیا ہے "پیام مشرق" کا چوتھا حصّہ "نقش فرنگ" کے نام سے موسوم ہے یہ وہ پیام ہے جو اقبال نے مشرق کی طرف سے مغرب کو بھیجا ہے سبک سخن کے اعتبار سے اس حصّے کی غزلیں بھی زیادہ تر حافظ کی پیروی میں ہیں۔ اسی حصّے میں متعدد قطعات مختلف ہیئتوں اور گوناگوں عناوین کے تحت درج ہیں جن میں شوپن ہار، نیٹشے، ٹالسٹائی، کارل مارکس، لینن، ہیگل، رومی، برگسان، مزدک، آئین سٹائین اور کانٹ وغیرہم کے افکار کو بالاختصار بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے "پیام مشرق"

۳۔ "دیوانِ حافظ" امیر کبیر، تہران، ۱۳۳۷، ص ۱۹

کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔

"پیام مشرق" ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی یعنی اس دور میں جب مغرب کی استعماری طاقتیں مشرق کو اپنی یغماگری کا ہدف بنائے ہوئے تھیں، سارا مشرق ایک عجیب آشفتگی، بدحالی اور پریشانی کا شکار ہو رہا تھا۔ سیاسی اور اجتماعی زوال کے ساتھ ساتھ مغربی مادیت کے اثر سے مشرق کے پُرنور اُفق پر اندھیرے ہی اندھیرے چھا رہے تھے۔ اور انسان ان اندھیروں کی آڑ میں بڑی بے دریغی سے انسانی ناموس کا پردہ چاک کر رہا تھا۔

مشرق کی بیداری کیلئے اقبال خودی یا استحکام ذات کے فلسفے کو پیش کر کے اہلِ مشرق کو انسان کی لامحدود اور غیر فانی معنوی اور روحانی اقدار سے روشناس کرا چکا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اقبال نے اجتماعی قدروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مغرب کو مادہ پرستی کے برعکس مذہب اور روحانیت کی تعلیم دینی شروع کی اور اس میدان میں وہ مشرق کا زبردست معنوی مبلغ بن کر اُٹھا اور اسی معنویت کے درس کو اس نے انسانی رفاہ و فلاح کا واحد ذریعہ قرار دیا۔

"پیام مشرق" اقبال نے جرمنی کے بلند پایہ شاعر گوئٹے کے "دیوان غربی و شرقی" کے جواب میں لکھی۔ گوئٹے نے اپنا یہ دیوان جو اس کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے کچھ ایسے ہی آشفتہ اور پُراضطراب حالات میں لکھا تھا۔ دراصل انقلاب فرانس کے بعد یورپ کچھ اس طرح بیدار ہوا کہ مادیت کے سوا اسے دُنیا میں کوئی اور قدر دکھائی ہی نہ دی اور مادی رجحان کی رو میں بہہ کر معنویت اور وجدان سے بہت ہی دُور جا پڑا، چنانچہ یورپ کی مادی فضا ایک حساس روح اور ایک معنویت پسند

شخص کیلئے ناقابلِ زیست بن گئی۔ گوئٹے جیسے انسان دوست آدمی کیلئے ایسی مکدر اور مسموم فضا میں دم لینا دشوار تھا چنانچہ وہ مغرب سے فرار کر کے مشرق میں پناہ لینے کیلئے مجبور ہو گیا۔ اسرائیلی شاعر ہائنا کے مطابق "دیوان غربی و شرقی" سے" اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے۔"

۱۸۱۴ء میں گوئٹے نے اپنے مجموعۂ کلام کو شعرائے مشرق کی روایت کے مطابق "دیوان" کا نام دیا اور "ہجرت" کے عنوان سے اس کا سر آغاز لکھا جو مختصراً یوں شروع ہوتا ہے۔

"شمال، مغرب اور جنوب پریشان اور آشفتہ ہیں تخت و تاج برباد ہو رہے ہیں اور سلطنتوں کے پائے لرز رہے ہیں۔ تو اس دوزخ سے دور بھاگ جا اور دل پذیر مشرق کا رخ کر تا کہ وہاں روحانیت کی ٹھنڈی ہوا تجھ پر چلے اور محفل عشق و شراب اور آب حیات تجھے زندہ کرے۔"

"آ کہ میں بھی اسی راہ کا مسافر ہوں تا کہ مشرق کی پاک فضاؤں میں گم ہو کر صدیوں پیچھے چلا جاؤں یہاں تک کہ ایک ایسے زمانے میں پہنچ جاؤں جس میں لوگ خدا سے آسمانی قوانین کو زمینی الفاظ کے وسیلے سے سیکھا کرتے تھے"

"آ کہ میں بھی دیارِ مشرق کا مسافر ہوں تا کہ وہاں گڈریوں کے ساتھ ایک پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی بسر کروں۔

"اے حافظ! اس سفر دور و دراز میں اور ان وادیوں کے نشیب و فراز

۴۔ پیام مشرق، دیباچہ، ص ۹

میں ہر جگہ تیرے آسمانی نغمے میرے ہمسفر ہیں اور میرے دل کیلئے موجب تسکین ہیں، اے حافظ مقدس! میری آرزو یہ ہے کہ میں سفر و حضر میں ہر جگہ تیرے ساتھ رہوں۔"۵

ثانیاً یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ مشرق و مغرب میں جو خلیج حائل ہو رہی تھی اور جس طریق سے انسان کو انسان سے جدا کیا جا رہا تھا وہ گوئٹے جیسے وسیع مشرب انسان کیلئے قابلِ تحمل نہ تھا۔ لہٰذا اس نے احترامِ آدمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انسان کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کی زبردست مہم شروع کی۔ چنانچہ "دیوانِ شرقی و غربی" ایک عظیم اجتماعی فلسفے کا سنگِ بنیاد ہے جس کے ذریعے عالمِ انسانی کے اتحاد کی جامع اور بلیغ کوشش کی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ گوئٹے کا زمانہ قومی تعصب اور نیشنلزم کی ترویج کا زمانہ تھا، جس کے خلاف گوئٹے کی آفاقی اور ہمہ گیر طبیعت نے زبردست آواز بلند کی۔ دراصل مغرب میں مسیحی تعلیمات کا نتیجہ ایک رہبانی نظام کی شکل میں نکل چکا تھا جس نے بالآخر کلیسائی حکومت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس کلیسائی حکومت میں جیسا کہ یورپ کی مذہبی تاریخ سے واضح ہے دنیوی امور کے سلجھانے کا خانہ خالی تھا، نتیجۃً حکومت اور کلیسا ایک دوسرے سے بالکل مختلف صورتیں اختیار کر چکے تھے چنانچہ اسی وجہ سے لوتھر روسو، ہیگل، ملی، اور بعد ازاں نیٹشے وغیرہم نے کلیسائی حکومت کے خلاف عملی اور فکری بغاوتیں کیں۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

---

۵ "دیوانِ شرقی"، ترجمہ شجاع الدین شفا، تہران ۱۳۲۸، ص ۳۸، ۳۹

"جس ذہنی تحریک کا آغاز لوتھر اور روسو کی ذات سے ہوا۔ اس نے مسیحی دنیا کی وحدت کو توڑ کر اسے ایک ایسی غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تقسیم کر دیا جس سے اہلِ مغرب کی نگاہیں اس عالمگیر مطمحِ نظر سے ہٹ کر جو تمام نوعِ انسانی سے متعلق تھا۔ اقوام و ملل کی تنگ حدود میں الجھ گئیں۔ اس نئے تخیلِ حیات کے لئے انہیں ایک سے کہیں زیادہ واقعی اور مرئی احساس مثلاً وطنیت کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا اظہار بالآخر ان سیاسی نظامات کی شکل میں ہوا جنھوں نے جذبۂ قومیت کے ماتحت پرورش پائی ۶۔"

گوئٹے نے قومیت کے پست تصور کو پس پشت ڈالا اور انسانیت کی طرفداری اور انسانی برادری کو اپنا شعار بنایا۔ چنانچہ اس بارے میں دسمبر ۱۸۱۴ء میں اس نے لکھا:

"میں چاہتا ہوں اس دیوان کو ایک آئینہ یا جامِ جہاں نما کی صورت دوں اور اس میں مشرق و مغرب کو ایک دوسرے کے قریب لا کر دکھاؤں" ۷۔

مئی ۱۸۱۵ء میں لکھتا ہے:۔ "میری آرزو اور میرا مقصد یہ ہے کہ میں مشرق کو مغرب کے اور ماضی کو حال کے اور ایرانی کو جرمن کے نزدیک کروں اور ان علاقوں کے لوگوں کے طرز، عادات اور رسوم کو ایک دوسرے سے آشنا کراؤں" ۸۔

۶۔ "حرفِ اقبال" لاہور، ۱۹۴۷ء، ص ۱۹۔

۷۔ "دیوانِ شرقی" ترجمہ شجاع الدین شفا تہران ۱۳۲۸، ص ۲۵۔

۸۔ ایضاً، ص ۲۶۔

ایک اور جگہ کہتا ہے: "مشرق اور مغرب اللہ کے ہیں اور شمال و جنوب بھی"۔ ۹

گوئٹے نے اتحاد انسانی کے اس عظیم مقصد کے لئے ایک "عالمی ادب" کا سہارا لیا۔ اس سلسلہ میں وہ اگرچہ گوناگوں اقوام کے تمدّن، طرز فکر اور مذہبی اختلافات سے دوچار ہوا لیکن وہ اپنے سارے دیوان میں اس بنیادی نکتے پر زور دیتا ہے کہ: "مشرق اور مغرب ایک دوسرے سے جدا نہیں اور انھیں بہر صورت ایک دوسرے سے قریب ہونا چاہیئے"۔ ۱۰

گوئٹے اس عالمی ادب کو وجود میں لانے کیلئے یورپی ادب کے تین بڑے دھاروں، یعنی فرانسیسی، جرمن اور انگریزی ادب کے علاوہ ہسپانوی، اطالوی اور قرونِ وسطیٰ کے ادب کو بھی ضروری قرار دیتا تھا۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اس امر کی تاکید کرتا رہا کہ دروازہ ادب کو مکمل طور پر کھولنا چاہیئے تاکہ مشرق کے عظیم الشان شعرا یعنی حافظ اور سعدی بھی اس بزم میں شریک ہو سکیں۔ ۱۱ وہ اہلِ علم و دانش کو اس بات کی تلقین کرتا رہا کہ وہ اپنے آپ کو "قومیّت" کی چار دیواری میں محبوس کرنے کی بجائے اپنی نظریں آفاقی بلندیوں پر رکھیں اور ایک دوسرے کا احترام کریں۔

۹۔ ایضاً، ص ۴۰

۱۰۔ ایضاً ص ۲۷

۱۱۔ ایضاً

دوسری بات جو "دیوان غربی و شرقی" میں خاص اہمیت کی حامل ہے وہ قومی اور مذہبی تعصبات سے گوئٹے کی شدید نفرت ہے۔ گوئٹے نے اپنے دیوان میں حافظ کی طرح جس کا ایمان اور فرمان ہے ؎

آسائشِ دو گیتی تفسیر این دو حرف است
با دوستان مروت با دشمنان مدارا [۱۲]

یہ کوشش کی ہے کہ وہ خشک تعصبات کی بجائے وجدان اور منطق کو اپنا شیوہ اور شعار بنائے۔ چنانچہ اس وجدانی رجحان اور منطقی غلبے کی بنا پر وہ کہتا ہے:

"اگر اسلام کے معنی اپنے امور اور ارادوں کو خدا کے سپرد کرنے کا نام ہے تو ہم سب مسلمان ہیں اور مسلمان ہی مریں گے۔"[۱۳]

گوئٹے کی توحید پرستی اور حقیقت پسندی ملاحظہ ہو، ایک دفعہ اس کی محبوبہ ماریان نے جسے وہ زلیخا کے نام سے پکارا کرتا تھا گلے میں صلیب پہن رکھی تھی۔ گوئٹے یہ دیکھ کر سخت برہم ہوا اور کہنے لگا: "کیا حافظ شیرازی تجھے اس بدنما ہار کے ساتھ اپنے شیراز میں داخل ہونے کی اجازت اور تجھے اپنے حضور میں جگہ دے گا؟ جا اور خدا کے شرک کی اس علامت کو دور پھینک دے۔"[۱۴]

اپنی نظم "ساقی نامہ" میں قرآن پاک کے متعلق لکھتا ہے: "بعض لوگ قرآن

۱۲۔ "دیوان حافظ"، امیر کبیر، تہران، ۱۳۴۷، ص ۲۱۔
۱۳۔ "دیوان شرقی" ص ۲۸
۱۴۔ ایضاً، ص ص ۹۸، ۹۹

کو قدیم اور بعض حادث تصوّر کرتے ہیں۔ مجھے اس راز کا علم نہیں اور نہ ہی میں اسے جاننا چاہتا ہوں کیونکہ میرا تو یہی ایمان ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور مسلمانوں کیلئے بس اتنا ہی جاننا کافی ہے"۔[۱۵]

گوئٹے نے پیغمبر علیہ السلام کی تعریف میں جابجا نظمیں کہی ہیں اور اس طریق سے کوشش کی ہے کہ شرق و غرب کے باہمی تعصبات کو ختم کرے۔ اور اہل مغرب پر دین اسلام کی عظمت اور ہمہ گیری کو واضح کرے، اس نے نپولین کے ساتھ ملاقات میں اپنی نظم "محمّد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم" پر تبصرہ کیا، نپولین نے جو خود پیغمبر اسلام کا مداح تھا والٹیر پر سخت نکتہ چینی کی کیونکہ موخرالذکر نے "المیہ محمّد" لکھ کر نبی کریم کی شان میں گستاخی کی تھی۔ گوئٹے نے "نغمۂ محمد" "برگزیدہ اشخاص" "ہجرت کا نواں سال" اور دیگر بہت سی منظومات میں حضرت نبی علیہ السلام کی تعریف و توصیف کی ہے "برگزیدہ اشخاص" میں وہ اپنے آپ کو جنگ بدر کے شہدا میں شمار کرتا ہے۔

اقبال گوئٹے کے ان پاکیزہ رجحانات سے بہت متاثر ہوا خصوصاً اس لحاظ سے بھی اقبال کو گوئٹے پسند آیا کہ جن انفرادی اور اجتماعی کیفیات کا اقبال تجربہ کر رہا تھا تقریباً اسی نقطۂ نظر سے گوئٹے نے ایک سو سال پیشتر انھیں علانیہ طور پر بیان کیا تھا۔ "پیام مشرق" کے آغاز میں اسی حقیقت کا اعتراف اقبال نے یوں کیا ہے ۔

ہر دو دانائے ضمیر کائنات ہر دو پیغام حیات اندر ممات

ہر دو خنجر صبح خند، آئینہ فام او برہنہ من ہنوز اندر نیام[۱۶]

"پیام مشرق" میں بعض نظمیں ملتی ہیں جو گوئٹے کے "دیوان مغربی و شرقی" کی

نظموں کا آزاد ترجمہ ہیں، مثلاً "حور و شاعر"، جس میں علامہ اقبال نے زندگی کی لامتناہی فعالیتوں کو بیان کیا ہے اور ان کی رو سے فلسفۂ ارتقا پر بڑی کامیابی سے بحث کی ہے، یہ نظم جواب ہے "حور و شاعر" کا جو "دیوان غربی و شرقی" کے حصۂ "خلد نامہ" میں درج ہے۔ اس نظم میں انسانی زندگی کے دوام کو مسلسل مقاصد آفرینی سے تعبیر کیا گیا ہے کہ انسان بلند سے بلند تر نصب العین کے حصول کیلئے کوشاں رہے چنانچہ اس کا اعلیٰ اور انتہائی نصب العین خدا ہونا چاہیئے اور بس ؎

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے — تپد آں زماں دل من پئے خوب تر نگارے

ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے — سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

طلبم نہایت آنکہ نہایتے ندارد

بہ نگاہ ناشکیبے بہ دل امیدوارے

اسی طرح "پیام مشرق" کی نظم "جوئے آب" آزاد ترجمہ ہے "نغمہ محمد" کا جس میں اقبال کے قول کے مطابق المانی شاعر نے زندگی کے اسلامی تخیل کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے، اس پرمعنی نظم کا آخری بند درج ذیل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دین اسلام نے کس طرح پرانی رسوم و قیود کو توڑ کر مال و دولت اور رنگ و نسب کے امتیازات کو نابود کیا۔ بندہ و آقا کی تمیز کو ختم کر کے انسانیت کو مساوات کے حقیقی اور فطری اصولوں سے روشناس کیا۔ مزید یہ کہ اسلام میں کسی

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۹

۱۶۔ "پیام مشرق"، ص ۳۔

قسم کے جمود فکری کی گنجائش نہیں۔ بلکہ وہ زندگی کے نت نئے تقاضوں سے دوبدو رہتا ہے اور اُنھیں پُورا کرنے کی پوری پُوری صلاحیّت رکھتا ہے اور اس طرح یہ دھارا اپنی لامتناہی منزل یعنی خدا کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے؎

دریائے پرخروش! زبند و شکن گذشت
از تنگنائے وادی و کوہ و دمن گذشت
یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را
از کاخِ شاہ و بارہ و کشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بیقرار
در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گذشت
زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ میرود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ میرود۱۸

یہاں بے جا نہ ہوگا اگر گوئٹے کی اصل نظم "نغمۂ محمدؐ" کو دہرا دیا جائے تاکہ واضح ہو سکے کہ گوئٹے دین اسلام کے علاوہ تمام مذہبی اور اجتماعی نظاموں اور رموں کو عالم انسانی کیلئے کس بیباکی کے ساتھ باطل اور منسوخ قرار دیکر صرف اور صرف دین اسلام کو بنی آدم کیلئے سعادت اور فلاح کا واحد ذریعہ بیان کرتا ہے۔ اس

۱۷۔ ایضاً، ص ص ۱۴۸۔ ۱۴۹۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۵۲۔

نظم میں وہ اسلام کو ایک اُبلتے ہُوئے چشمے سے تعبیر کرتے ہُوئے کہتا ہے :

"اُس چشمے کو دیکھو جو ستاروں کی کرنوں کی طرح ہنستا ہُوا صاف شفاف چٹانوں سے نکلا ہے۔ بچپن میں اسے قدسیوں نے اس دُنیا میں پالا جو بادلوں سے پرے ہے، شباب کی تازگی اور جوش لئے ہُوئے وہ خرام ناز کرتا ہُوا بادلوں سے نکلتا ہے۔ اور پتھروں کے بیچ میں سے جھاڑیوں سے گزر کر مرمریں چٹانوں پر گرتا اور پھر مسرّت کے نعرے لگاتا ہُوا آسمان کی طرف اچھلتا ہے . . ."

"نیچے وادی میں جہاں اس کا قدم پڑتا ہے پھُول کھِلنے لگتے ہیں اور اس کے دم سے سبزہ زار میں جان پڑ جاتی ہے۔ لیکن اسے نہ سایہ دار وادی روک سکتی ہے نہ وہ پھول جو اس کے گھٹنوں سے لپٹ لپٹ کر محبت بھری نگاہوں سے اس کی خوشامد کرتے ہیں۔

"چھوٹے چشمے اس کے دامن سے لپٹ کر چلتے ہیں۔ وہ چاند کی طرح چمکتا ہُوا میدان میں پہنچتا ہے، اور میدان بھی اس کی آب و تاب سے چمک اُٹھتا ہے۔ میدان کے دریا اور پہاڑوں کے چشمے پکار پکار کر کہتے ہیں۔ بھائی! اے بھائی! ہمیں بھی اپنے رب کے پاس لے چل، ہمیں بھی بے پایاں سمندر کی آغوش میں پہنچا دے . . . افسوس ہم اس کے مشتاق اس کی آغوش تک پہنچ نہیں پاتے۔ ریگستان کی پیاسی ریت ہمیں جذب کر لیتی ہے اور اوپر سے سورج چوسے لیتا ہے، کوئی پہاڑی راستہ روک کر ہمیں تالاب بنا دیتی ہے۔ اے بھائی! اپنے میدان والے بھائیوں کو، اپنے پہاڑ والے بھائیوں کو اپنے ساتھ اپنے رب کے پاس لے چل۔

"آؤ سب کے سب آؤ! اب وہ بڑی شان سے موجیں مارتا ہوا بڑھتا ہے

اور ملکوں پر اپنا سکہ بٹھاتا چلا جاتا ہے۔ جہاں اس کا پاؤں پڑتا ہے شہر آباد ہو جاتے ہیں۔

"اس کا بہاؤ کسی کے روکے نہیں رکتا۔ وہ زور و شور سے میناروں کی چمکتی چوٹیوں اور مرمریں عماروں کو پیچھے چھوڑ کر تخلیق کے جوش میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے[19]"

اقبال کہتے ہیں ؎

تُمثلِ آئینہ مشو محوِ جمالِ دگراں از دل و دیدہ فرو شوے خیالِ دگراں
آتش از نالہ مرغانِ حرم گیر و بسوز آشیانے کہ نہادی بہ نہالِ دگراں[20]

اقبال اہلِ نظر کے حق میں گوئٹے کے احسانات کا اعتراف کرتا ہوا کہتا ہے ؎

صبا بہ گلشنِ ویمر سلامِ ما برساں
کہ چشم نکتہ وراں خاکِ آں دیار افروخت[21]

کتاب کے آخر میں اقبال نے گوئٹے کی طرح مغرب کی غیر فطری تہذیب کو ہیچ قرار دیتے ہوئے اسے مشرق کی جانب سے پیغام بھیجا ہے کہ وہ عقل کی بجائے عشق کی طرف رجوع کرے کیونکہ یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو اس کی صحیح منزل تک پہنچا سکتا ہے اور یہی وہ افلاطون و جالینوس ہے جو انسان کی جملہ علتوں کا مداوا ہے، کیونکہ عقل کے ہاتھوں انسان اور بھی زیادہ مریض ہو گیا ہے

از من اے بادِ صبا گوے بہ دانائے فرنگ عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری عجب این است کہ بیمارِ تو بیمار تر است

19- اردو ڈائجسٹ، جون ۱۹۶۸ء، ص ۱۲ - 20 پیام مشرق ص ۲۰۹

دانش اندوختۂ دل زکف انداختۂ!
آہ زاں نقد گرانمایہ کہ درباختۂ!۲۲

"حکمتِ فرنگ"، "جلال و ہیگل"، "پیغام برگساں"، "میخانۂ فرنگ"، "جلال و گوئٹے"، "شعرا" اور "الملک للہ" بھی اسی انداز کی نظمیں ہیں جن کے تجزیہ و تحلیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ان منظومات اور دیگر اکثر اشعار میں علامہ اقبال نے خاص طور پر یہ کوشش کی ہے کہ وہ مغرب کو مشرق کی ان روحانی اقدار سے آشنا کرائیں جو مشرق و مغرب سے بالاتر انسانی مقام کا تعین کرتی ہیں اور جن کی رو سے ساری مخلوق خدا کا کنبہ قرار پاتی ہے۔ اور اگر شرق و غرب کی مختلف اقوام ان قدروں سے بے بہرہ، محض مادیت کو اپنا مقصد بنالیتی ہیں تو یہ ترقی، یہ تمدن اور یہ علم و فن، یہ سائنس اور اس کے یہ حیرت انگیز انکشافات نہ صرف بے سود اور بے معنی ہیں بلکہ انسان کیلئے موت کا حکم رکھتے ہیں۔

"طیارہ" کے عنوان سے پیامِ مشرق میں ایک نظم علامہ نے لکھی ہے کہ ٹہنی پر بیٹھا ایک پرندہ طنزیہ انداز میں کہہ رہا تھا کہ خدا نے انسان کو بال و پر عطا نہیں کئے اور اسے قوتِ پرواز سے محروم رکھا ہے۔ تو میں نے کہا کہ پھر کیا ہُوا؟ ہم نے طیارہ سے اپنے بال و پر بنائے ہیں اور آسمانوں میں راہیں نکال لی ہیں۔ یہ طیارہ شاہین تو کیا فرشتے سے بھی زیادہ قوی اور پرواز میں سریع ہے۔

۲۱۔ ایضاً ص ۱۸۴
۲۲ ایضاً ص ص ۲۲۵، ۲۲۶

اس پر اس زیرک پرندے نے مجھے ذرا دوستانہ نظر سے دیکھا اور ننھی سی چونچ سے اپنے بال و پر سنوارتے ہوئے کہا۔

تو کارِ زمین را نکو ساختی
کہ با آسمان نیز پرداختی

یعنی کیا تو نے زمین کے سب کام ٹھیک کر لئے ہیں کہ آسمانوں پر چڑھنا شروع کر دیا ہے؟

طیارہ تو انسان نے بنا لیا مگر اس لئے نہیں کہ اس سے اہلِ زمین پر گل افشانی کرے بلکہ اسلئے کہ اس کے ذریعے بنی نوع انسان پر آگ برسائے۔ درحقیقت انسان کی بقا اور ترقی کا راز احترامِ آدمیت میں مضمر ہے اور بس اور اگر انسان فی الواقع چاہتا ہے کہ وہ عزت اور ناموس کے ساتھ زندگی بسر کرے اور اپنی خدا داد صلاحیتوں اور استعدادوں سے استفادہ کرے اور انسانی تہذیب و تمدن کو فروغ دے تو ضروری ہے کہ وہ رنگ و نسب کے ناپاک تصورات اور قومیت و طنیت کے ذلیل عقائد کو اپنے ذہن سے یکسر ترک کر دے اور انسانی اخوت اور محبت کو اپنا شعار اور نصب العین بنائے۔

چارہ اینست کہ از عشق گشادی طلبیم
پیش او سجدہ گزاریم و مرادی طلبیم

اقبال اور تحریکِ اتحادِ اسلامی

پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴) سے قبل اور بعد کے زمانے میں عالم اسلامی بڑی صبر آزما صورتِ حال سے دو چار ہوا۔ چاروں طرف تاریکی کے بادل چھا رہے تھے۔ صرف اتحاد اسلامی کا ایک نازک سا جذبہ تھا جو شعاعِ امید بن کر کچھ ڈھارس بندھا رہا تھا۔ تحریک اتحاد اسلامی کے داعی سیّد جمال الدین افغانیؒ چند برس پہلے (۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو) انتقال فرما چکے تھے لیکن ان کے افکار ترکی، ایران اور عرب ممالک میں اتحاد و استقلال کی روح پھونک رہے تھے۔ برعظیم ہند و پاک کے مسلمان اپنی محکومی کے علی الرغم اس تحریک سے بہت متاثر تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اگرچہ دنیا کا نقشہ بدل چکا ہے اور عالم اسلامی میں بھی بڑے بڑے انقلاب آچکے ہیں۔ لیکن آزمائش کا دور ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ اس میں فلسطین، کشمیر، قبرص اور اریٹیریا کے نازک مسائل اور بڑی طاقتوں کی اسلام دشمن پالیسیوں کی وجہ سے پہلے سے زیادہ شدت پیدا ہو چکی ہے ان پریشان کن حالات میں امید کی روشنی اگر کہیں نظر آتی ہے تو وہ اسلامی ممالک کے اتحاد و یک جہتی کے فروغ پذیر رجحان میں ہے۔ رباط میں اسلامی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس (۱۹۶۹ء) کے بعد جدہ اور کراچی میں وزارتی سطح پر اسلامی ممالک کا اجتماع (مارچ و دسمبر ۱۹۷۰ء) اور مستقل سیکرٹریٹ قائم کرنے کا فیصلہ دنیائے اسلام کی آزادی، ترقی اور خوشحالی کی طرف اہم اقدام ہے۔ آج ہم جس شاہراہِ اتحاد پر گامزن ہیں اس کا سلسلہ ماضی قریب سے پیوستہ ہے موجودہ صدی کے شروع میں اتحادِ اسلامی کی جس تحریک نے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں میں جذبۂ بیداری پیدا کیا۔ اُسی سے آزادیِ وطن کے برگ و بار پھوٹے، اسی سے بالآخر پاکستان معرضِ وجود میں آیا اور یہی جذبہ اتحادِ اسلامی کی موجودہ کوششوں میں بھی کارفرما ہے۔ اقبال نے تحریک اتحادِ اسلامی کی روح کو اپنے کلام میں سمو کر پیش کیا اور اس لحاظ سے ان کی شاعری کا وہ دور خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو ان کی انگلستان سے واپسی (۱۹۰۸ء) کے بعد شروع ہوا اور بانگِ درا کی اشاعتِ اوّل (۱۹۲۴ء) تک چلا گیا ہے۔ اس

مختصر دور کو بھی عالمی واقعات اور ان کے ردِعمل کے ضمن میں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ جنگِ عظیم سے قبل اور دوسرا حصہ جنگِ عظیم کے فوراً بعد جو تحریکِ خلافت کا زمانہ کہلاتا ہے۔ اسی دوران میں اقبالؔ نے اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کی تخلیق کر کے اپنے مربوط نظامِ فکر کو پیش کیا اور پھر پیامِ مشرق کی صورت میں المانی شاعر گوئٹے کے دیوانِ مغربی کا جواب لکھ کر مغرب کی پیاسی روح کو مشرق کی طرف سے حیات بخش پیغام دیا۔

اقبالؔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک یورپ میں رہے۔ یہ زمانہ ان کی شعری تخلیقات کے لحاظ سے کچھ زیادہ اہم نہیں۔ بلکہ شیخ عبدالقادر کے بقول اس زمانے میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب اقبالؔ نے شاعری ترک کرنے کا خیال ظاہر کیا اور آخر آرنلڈ کے سمجھانے پر وہ اس خیال سے باز آئے البتہ نظریاتی تبدیلی کے لحاظ سے یہ زمانہ اقبالؔ کی زندگی میں بہت اہم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو باتیں خاص طور سے ان کی نظریاتی تبدیلی کا باعث بنیں۔ ایک تو یورپ کا نظریۂ قومیت (نیشنلزم) جو دورِ جدید کے تصورِ وطنیت کی بنیاد تھا۔ اور اقبالؔ بھی شروع میں اس سے متاثر رہے تھے۔ یورپ کے زمانہ قیام میں اقبالؔ نے اس نظریئے کے مضر پہلوؤں کا قریب سے مشاہدہ کیا تو انہیں نظر آیا کہ اہلِ یورپ اس محدود تصور کی بدولت انسانی قدروں کو پامال کر کے خود بھی ہلاکت اور بربادی کی طرف رواں دواں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھیں اسلام کے دیئے ہوئے نظریۂ قومیت کی طرف رجوع کرنا پڑا

جو رنگ و نسل و زبان کی بنیاد پر نہیں بلکہ عقیدے کی بنیاد پر استوار ہے اور اس میں جغرافیائی حد بندی ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ غالباً اسی اثنا میں اقبالؔ اتحادِ اسلامی کی تحریک سے جسے اہلِ یورپ نے پان اسلام ازم کا نام دے رکھا تھا متاثر ہوئے۔ ان دونوں اثرات کا ثبوت اقبالؔ کی اس زمانے کی بعض نظموں پیامِ عشق عبدالقادر کے نام صقلیہ اور چند غزلیات (بانگِ درا ص۱۴۴ ص۱۴۹ ص۱۵۰) سے ملتا ہے[1] یورپ سے واپس آکر ان تاثرات میں ملکی حالات اور بلادِ اسلامیہ کے واقعات کے تحت شدت پیدا ہوئی اور اقبالؔ تحریکِ اتحادِ اسلامی کے خوش نوا پیامبر بن گئے۔

دسمبر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد مسلمانانِ ہند کی سیاست کا نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کی ایجی ٹیشن سے متاثر ہو کر دسمبر ۱۹۱۱ء میں شاہی دربار کے موقع پر برطانوی حکومت نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کیا تو

---

[1] بانگِ درا کے یہ دو شعر اقبال کے اس نظریئے اور روش کی وضاحت کرتے ہیں

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اس کی تلخی سے مسلمانوں کی سیاست میں شدت پیدا ہو گئی۔ ان داخلی واقعات کے ساتھ ہی اسلامی ممالک کے ابتلا کی دلخراش خبریں آنے لگیں اور مسلمانوں کے کرب میں اضافے کا باعث ہوئیں۔ ۱۹۰۷ء میں روس اور برطانیہ نے ایران کا بٹوارہ کر کے یہاں اپنے حلقہ ہائے اثر قائم کر لئے۔ اس کے ایک سال بعد ہی ایرانی حریت پسندوں نے قاچار شاہی کا تختہ الٹ دیا۔ ۱۹۰۹ء میں ترکی میں انقلاب آیا اور سلطان عبدالحمید کو معزول کر کے نوجوان ترک رہنماؤں نے اصلاح و ترقی کے منصوبے بنانے شروع کیے۔

اسلامی ممالک کے ان داخلی انقلابات کو یورپ کی استعماری طاقتیں بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔ پیشتر اس سے کہ ترکی کے نوجوان رہنما اپنے ملک کی حالت کو بہتر بنائیں سامراجی طاقتوں نے "یورپ کے مرد بیمار" کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست شروع کر دیا۔ دول یورپ کے منصوبے کے مطابق ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس (لیبیا) پر حملہ کر دیا۔ مصر پر برطانیہ قابض تھا، اس لئے ترکی اپنے اس دور افتادہ علاقے کی براہ راست کوئی مدد نہ کر سکتا تھا۔ تاہم کچھ نوجوان ترک جرنیل (انور پاشا اور مصطفےٰ کمال سمیت) محاذ جنگ پر پہنچے اور سنوسی اخوان اور ترکوں نے مل کر اطالوی فوجوں کی پیش قدمی کو ساحلی علاقوں پر روک دیا۔ طرابلس کی معرکہ آرائی ابھی جاری تھی کہ ۱۹۱۲ء میں ریاستہائے بلقان کی متحدہ فوجوں نے ترکی کے یورپی علاقے

پر حملہ کر دیا اور پیش قدمی کرتے ہوئے ادرنہ (ایڈریانوپل) پر قبضہ کر لیا یورپ کی سامراجی طاقتوں نے اس فتح پر جشن منائے۔ شاہِ یونان نے اس جنگ کو صلیبی جہاد قرار دیا۔ برطانوی وزیر اعظم نے فاتحین کو مبارکباد کا پیغام بھیجا طرابلس کے محاذ سے ترک جرنیلوں کو یورپی محاذ پر آکر صلیبی جنگ آزماؤں کی پیشقدمی کو روکنا اور انہیں پسپا کرنا پڑا۔

طرابلس اور بلقان کی جنگوں نے برِ عظیم کے مسلمانوں کو آتش زیرپا کر دیا تھا۔ اس زمانے میں زمیندار، الہلال، مسلم گزٹ، ہمدرد، کامریڈ نکل رہے تھے اور ان اخبارات نے اسلامی جذبات کی بھرپور ترجمانی کی۔ شبلی نعمانی نے "شہر آشوب اسلام" لکھ کر اپنے خامۂ خوں چکاں سے شیرازۂ اوراقِ اسلامی کے بکھرنے کا دردانگیز نوحہ کہا۔ دوسرے شعرا کے علاوہ اقبال نے بھی اس زمانے کے اسلامی جذبات کو اپنی مینائے شعر میں پیش کیا اور اتحادِ اسلامی کے تصوّر کو نصب العین قرار دے کر عالم اسلام کی اس نازک دور میں رہنمائی کی

اقبال نے قومی درد و الم کے اس دور میں بہت سی چھوٹی بڑی نظمیں لکھیں شکوہ، جواب شکوہ، شمع اور شاعر، مسلم، حضور رسالت مآب میں، فاطمہ بنتِ عبداللہ (عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی) محاصرہ ادرنہ، اسی سلسلے کی نظمیں ہیں۔ "شکوہ" میں شاعر نے عوامی جذبات کو شکایت کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا ہے تو "جواب شکوہ" میں

مسلمانوں کی پستیٔ احوال کا تجزیہ کیا ہے ذیل کے تین بندوں میں دیکھیے کہ شاعر نے عصری واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے کس طرح مسلمانوں کے درد والم کا مداوا بھی کیا ہے اور انہیں پیغام بیداری بھی دیا ہے۔

عہدِ نو برق ہے آتش زنِ ہر خرمن ہے
ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے
ملتِ ختمِ رسلؐ شعلہ بہ پیراہن ہے

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کشتیٔ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے دھندلا سا ستارا تو ہے

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا ؛
غافلوں کے لیے پیغام ہے بیداری کا

تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا
امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا
کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

"شمع اور شاعر" اس دور کی اہم ترین طویل نظم (بصورت ترکیب بند) ہے جو فروری ۱۹۱۲ء میں تخلیق ہوئی۔ یاس و الم کی اس کربناک فضا میں شاعر نے شمع کی زبانی عصری حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے خاص نظامِ فکر کے مطابق مسلمانوں کو احساسِ خود شناسی سے آگاہ کیا ہے اور آخر میں اُمید افزا پیغام سنایا ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ کم و بیش اسی زمانے میں مثنوی اسرارِ خودی کی تخلیق کا آغاز ہوا۔ اس غم انگیز ماحول میں اقبال کی مفکرانہ بصیرت اسلام کی نشاۃ الثانیہ کا جائزہ لے کر ملّت کے روشن مستقبل کا تصور پیش کر رہی تھی۔ "شمع اور شاعر" میں اسی تصوّر کی جھلک نمایاں ہے یہ نظم فکرِ اقبال میں اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے نقطۂ نظر سے دسمبر ۱۹۱۰ء کے خطبۂ علی گڑھ "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کی طرح بنیادی حیثیت رکھتی ہے

اس دَور کی مختصر نظمیں بھی اس لحاظ سے بڑی اہم ہیں کہ ان میں اقبال نے اس زمانے کے بعض چھوٹے چھوٹے واقعات کے حوالے سے غیرتِ ملی

کو جھنجوڑا ہے اور انحطاط و زوال کی تاریکیوں میں اسلامی جذب و شوق اور غیرت و حمیت کے پرتاثیر مرقعے پیش کئے ہیں۔ "حضور رسالت مآب میں" شاعر نے اپنے آبگینہ شعر میں طرابلس کے شہیدوں کا لہو بھر کر حضور کی نذر کیا ہے۔

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

طرابلس کی جنگ میں فاطمہ بنت عبداللہ کی شہادت بظاہر ایک عام واقعہ تھا کہ ایک عرب لڑکی بڑے والہانہ جذبے سے غازیوں کو پانی پلاتی پلاتی خود بھی جام شہادت نوش کر گئی، لیکن شاعر کی نگاہ اس واقعے میں ملت کے تابناک مستقبل کی جھلک دیکھتی ہے۔

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

جس قوم کی بیٹیاں سرفروشی کے یہ کارنامے انجام دے سکتی ہوں اس کا مستقبل کبھی مخدوش نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ شاعر اگر فاطمہ بنت عبداللہ کی تربتِ خاموش میں ایک قوم تازہ پلتے دیکھتا ہے تو یہ امر فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں

بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعتِ مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں

طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے بعد جنگِ عظیم شروع ہوگئی اور ترکی بھی جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے جنگ کی لپیٹ میں آگیا۔ چار سال بعد نومبر ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی تو اسلامی ممالک خاک و خون میں تڑپ رہے تھے۔ انگریزوں کی شاطرانہ چالوں نے عربوں کو ترکوں کے خلاف صف آرا کر دیا تھا۔ ترکی سلطنت کے بیشتر علاقوں پر (اناطولیا کے سوا) اتحادی فوجیں قابض ہو چکی تھیں۔ مقاماتِ مقدسہ برطانیہ کی تحویل میں آچکے تھے۔ اعلانِ بالفور نے عربوں کے لئے بھی خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔ لیکن عرب ابھی اس خطرے سے بے نیاز برطانیہ کی نیک نیتی پر تکیہ کئے بیٹھے تھے۔ دنیائے اسلام کے اس سانحۂ عظیم پر برِ صغیر کے مسلمان تڑپ گئے اور انہوں نے نتائج و عواقب سے بے پرواہ ہو کر تحریکِ خلافت اور ہجرت کا آغاز کر دیا۔

اقبالؔ ہنگاموں کی اس فضا میں غور و فکر کے سمندر میں غوطہ زن ہوئے اسی کرب و اضطراب کے عالم میں ان کی دو طویل نظمیں "خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" تخلیق ہوئیں۔ اقبالؔ کی یہ دو نظمیں ان کے فکر و فن کا شاہکار ہیں۔ دونوں نظموں کا لہجہ موضوع اور موقع و محل کے لحاظ سے الگ الگ ہے "خضرِ راہ" کا رنگ ایمائی ہے اور انداز ڈرامائی۔ شاعر نے خضرؑ کی زبانی واقعات

عالم اور مسائلِ حیات پر اس طرح دھیمے اور سلجھے ہوئے انداز میں تبصرہ کیا ہے کہ مستقبل کے امکانات پوری طرح روشن ہو جاتے ہیں۔ طلوعِ اسلام کا انداز اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس ترکیب بند نظم میں شاعر نے خطیبانہ جوش و خروش کے ساتھ لیکن جذبے اور فکر کی آمیزش سے قوم کو پیغامِ عمل دیا ہے۔ دونوں نظموں کا تحریکِ اتحادِ اسلامی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔

"خضرِ راہ" میں اقبال نے جنگِ عظیم کے بعد پیدا ہونے والی عالمی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے خضر کی زبانی مسلمانانِ عالم کو جو پیغام دیا ہے اس میں تحریکِ اتحادِ اسلامی کی روح سمٹ آئی ہے۔

ربط و ضبطِ ملّتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر

"خضرِ راہ" کی تخلیق یاس انگیز حالات میں ہوئی تھی "طلوعِ اسلام" کی تخلیق

اس وقت ہوئی جب اس تاریک فضا میں دفعتاً ایک شعاعِ امید چمکی اور ڈوبتے دلوں کو سہارا دے گئی۔ یہ وہ فتح عظیم تھی جو بے سروسامان ترکوں کو یونانیوں کے خلاف ۱۹۲۲ء میں حاصل ہوئی اور جس کے بعد پرچمِ ہلال پھر سمرنا اور استنبول پر لہرانے لگا اور ترک عہد نامہ سیورے کی ذلت آمیز شرائط کے بعد لوزان کانفرنس میں آبرومندانہ صلح نامہ طے کرانے میں کامیاب ہوئے اس فتح مبین نے شاعر کے افکار میں جولانی پیدا کی اور اسے طلوعِ اسلام کی پُرانوار کرنیں مطلعِ روزگار پر چمکتی ہوئی نظر آنے لگیں۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کردیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

اقبال نے یہ پیغام آج سے تقریباً نصف صدی پیشتر اُس وقت دیا تھا۔ جب دنیا کے نقشے پر کوئی آزاد اسلامی ملک نظر نہیں آتا تھا۔ آج کی صورتِ حال

اس سے قطعی مختلف ہے۔ آج آزاد اسلامی ممالک ایک لڑی کی مانند مراکش سے انڈونیشیا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ برصغیر میں آزاد اسلامی مملکت پاکستان اقبال کے اسی تصوّر اور اسلام کے عقیدے کی بنیاد پر وجُود میں آئی۔ اس لئے مذکورہ اشعار کے آخری مصرع میں 'ذہنِ ہندی' سے 'ذہنِ پاکستانی' مراد لیا جا سکتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ جن خطرات سے نصف صدی پہلے دوچار تھی، وہ آج بھی اسے دعوتِ مبارزت دے رہے ہیں۔ اس دعوتِ مبارزت کا جواب ایک ہی صورت میں ممکن ہے اور وہ ہے اتحادِ عالمِ اسلامی۔ اقبال کا یہ پیغام آج بھی اسی طرح زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اقبالؒ اور قومی زبان

"اقبال اور اردو" یہ موضوع ادبی اور علمی لحاظ سے بھی بہت اہم ہے اور قومی زبان کے نقطۂ نظر سے بھی۔ پنجاب نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی، وہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ انجمن پنجاب کی خدمات اور شیخ عبدالقادر کے "مخزن" کے کارنامے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں لافانی ہیں۔ اقبال نے اپنے ابتدائی ادبی دور میں غالب پر نظم لکھتے ہوئے یہ کہا تھا:

اپریل ۱۹۶۸ء میں بی۔ این۔ آر سینٹر میں پاکستان کلچرل کونسل کے زیر اہتمام منعقدہ یوم اقبال کے موقع پر پڑھا گیا۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

اقبال نے گیسوئے اردو خود بھی سنوارے اور دوسروں کو بھی اس طرف توجہ دلائی۔ ان کے اردو کلام نے جس میں فکر و نظر کی وسعت اور شعریت و تغزل کا حسین امتزاج ہے، اردو میں اظہار و بیان کے اعلیٰ ترین پیرائے پیدا کیے۔ شاعری کے علاوہ اقبال نے اردو زبان کی ایک اور اہم خدمت بھی انجام دی جس کا جائزہ ابھی پوری طرح لیا نہیں گیا۔ یہ اقبال کی علمی نثر ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اقبال ۱۸۹۹ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں تین چار سال تک میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے تدریسی اور تصنیفی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اقبال کی اس دور کی علمی تصانیف اور بعد کے اردو مکاتیب میں جس قسم کا سادا، سلیس، رواں اور ادائے مطلب کے لیے حشو و زوائد سے پاک مٹھوس نثر کا پیرایہ ملتا ہے، اس نے اردو زبان کو علوم و فنون کی زبان بنانے میں اہم حصہ لیا۔ میرے خیال میں اقبال کی اس خدمت کا ابھی جائزہ نہیں لیا گیا اور نہ ہی اس کا اعتراف کیا گیا ہے۔ آج کی مجلس میں اقبال کی ان خدمات اردو کے جائزے کا موقع نہیں۔ اس لیے میں اُن کا تذکرہ تمہید کے طور پر کرنے کے بعد "اقبال اور اردو" کے اس اہم مسئلہ پر آتا ہوں جس کا تعلق ہماری اجتماعی جد و جہد اور تعمیر ملت سے ہے

اقبال نے ۲۷ ستمبر ۱۹۳۶ء کو مولوی عبدالحق کے نام ایک خط میں لکھا

"اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔"

اس علمی مجلس میں اس وضاحت کی تو شاید ضرورت نہیں کہ عصبیت اور تعصب دو الگ الگ کیفیتوں اور مختلف معنوں کے حامل الفاظ ہیں۔ اپنی میراث سے محبت کا جذبۂ صادق عصبیت کہلاتا ہے اور دوسروں کے خلاف بلاوجہ نفرت و حقارت کا جذبہ تعصب کہلاتا ہے۔ اس لیے عصبیت جہاں مستحسن ہے، وہاں تعصب مذموم۔ لیکن ہمارے بعض روشن خیال بزرگ بزعم خود انسان دوستی اور رواداری کے مفہوم میں ان دونوں کو گڈ مڈ کر جاتے ہیں، اس لیے یہ وضاحت ضروری معلوم ہوئی۔

اقبال نے اپنے اسی خط میں یہ بھی لکھا:

"مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لیے جو لڑائیاں آئندہ لڑنا پڑیں گی ان کا میدان پنجاب ہو گا۔ پنجابیوں کو اس میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی۔ کیونکہ اسلامی زمانے میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی۔ مگر اس کا کیا علاج

کہ آئندہ رزم گاہ یہی سرزمین معلوم ہوتی ہے۔"

اپنی وفات سے ایک برس پہلے ۲۸ اپریل ۱۹۳۷ء کو اقبال نے مولوی عبدالحق کے نام خط لکھتے ہوئے اپنی اس آرزو کا اظہار بھی کیا:

"کاش میں اپنی زندگی کے باقی دن آپ کے ساتھ رہ کر اردو کی خدمت کر سکتا۔"

اقبال کے اس خیال اور آرزو کی بنیاد کیا تھی؟ آیئے اس مسئلے کو ذرا تاریخی تناظر کے حوالے سے دیکھیں۔

جن لوگوں نے تحریک پاکستان کے اسباب و علل پر نظر ڈالی ہے انھیں معلوم ہے کہ یہ تحریک دراصل اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب صرصر حوادث نے مغلیہ سطوت کا چراغ گل کرنا شروع کر دیا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی اور برہمن ازم کی ملی بھگت نے تعلیمی، معاشی اور لسانی اعتبار سے اپنے لیے راستہ ہموار کرنا شروع کر دیا تھا۔ انگریز اور ہندو کی اس سازش کا علم مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے دس برس بعد ہوا جب ہندوؤں نے صدیوں کے ہندو مسلم ملاپ کی تاریخی میراث اردو کو اپنانے سے انکار کرتے ہوئی ہندی کا مطالبہ شروع کیا۔ یہی لسانی فساد تھا جس نے بڑھتے بڑھتے ایسی نازک صورت اختیار کی کہ بالآخر برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم ہونا پڑا۔ یہ بات

صرف زبان ہی کی نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے کچھ اور مضمرات بھی تھے۔ تاریخ نے صدیوں کے بعد ہندو کو یہ موقع دیا تھا کہ وہ انگریزی سامراج کا سہارا لے کر اپنے برہمنی اقتدار کے اسی چکر کو حرکت میں لائے جو دو ہزار سال قبل بدھ مت کے خلاف استعمال ہو کر اسے دیس نکالا دے چکا تھا۔ اگر ہندو اپنے اس مذموم مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو اس برصغیر میں بھی مسلمانوں کے عروج و اقتدار کا ہزار سالہ دور ہسپانیہ کی تاریخ کی طرح ایک بھولی بسری کہانی بن کر رہ جاتا۔ لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا کہ مسلمان برہمن ازم کے اس سیلاب میں یوں جذب ہو کر فنا ہو جائیں۔ مسلمان اکابر نے بر وقت اس خطرے کا احساس کیا اور جد و جہد کے مختلف نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے پاکستان کی صورت میں اپنی قومی ہستی کے تحفظ اور تشخص کے لیے ایک گوشہ حاصل کر لیا۔

اس قومی ہستی کی دو اساسی قدریں تھیں اور ہیں۔ ایک دین اسلام اور دوسری اردو زبان۔ اسی لیے اقبال کو یہ کہنا پڑا کہ:

"میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔"

آج جبکہ اقبال کو ہم سے جدا ہوئے تیس برس اور قیام پاکستان کو بھی اکیس برس ہو چکے ہیں، ہمارے بعض روشن خیال دانشور ہمیں یہ

ایڈیشن دے رہے ہیں کہ یہ سب باتیں محض پروپیگنڈے کی خاطر تھیں، اصل مسئلہ تو اقتصادی تھا۔ یہ مذہب اور یہ زبان کے مسئلے اب گزرے وقت کی راگنیاں ہیں۔ اب ہمیں "روادار" بن کر پاکستان کی اقتصادی ترقی کے بارے میں سوچنا اور کام کرنا چاہیے۔ اور پھر یہ بھی فرمایا جاتا ہے کہ ہماری تہذیب تو دراصل بہت پرانی، اور ہڑپہ اور موہنجو دارو کے آثار قدیمہ سے وابستہ ہے۔

پاکستان کی اقتصادی ترقی کا کون شخص منکر ہے؟ اچھی روٹی، بلکہ ڈبل روٹی کھانا کون نہیں چاہتا؟ لیکن یہ جو آپ پیٹ کی خاطر اپنی قومیت کی جڑوں کو کاٹ دینا چاہتے ہیں، کیا اس خطرناک کھیل کے نتائج کا بھی آپ کو احساس ہے؟

اگر چند لمحوں کے لیے آپ کے مفروضات مان لیے جائیں تو پھر خود ہی بتائیے کہ اسلام اور اردو کے بغیر پاکستان کے وجود کا جواز ہمارے پاس کیا رہ جاتا ہے۔ کیا ہمارے نام نہاد دانشوروں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اس طرز استدلال سے وہ نادانستہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا رہے ہیں جو بھارتی بینا اپنی بے پناہ مادی قوت کے باوجود (۱۹۶۵ء میں) نہ کر سکی۔

تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ اور آپ کو یہ بتانے کی تو شاید